وعلی اللہ قصد السبیل
دورِ حاضر کے
سیاسی اور اقتصادی مسائل
اور
اسلامی تعلیمات و اشارات
حضرت مولانا السید محمد میاں صاحب
محدث، فقیہ، مورخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ
مکتبہ قاسمیہ
اردو بازار لاہور

دورِ حاضر کے

سیاسی اور اقتصادی مسائل

اور

اسلامی تعلیمات و اشارات

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی

صدر جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی جمعیۃ علماء ہند و سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند

مکتبہ قاسمیہ

اردو بازار، لاہور

نام کتاب --- دورِ حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل

مصنف ----- حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

صفحات ---------- دو سو بتیس ۲۳۲

تاریخ طباعت --- جمادی الثانی ۱۴۰۳ھ / اپریل ۸۳ء

پریس ----------

تعداد --------- ایک ہزار

قیمت --------

طبع فی

المطبعة العربية

۳۰- لیک روڈ، بالمقابل مفتی جیمبرز پرانی انار کلی، لاہور (پاکستان)

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

موضوع اور مقصد

دُنیا دو طبقوں میں بٹ گئی ہے۔ صاحبِ سرمایہ۔ اور محنت کش مزدور۔ ان دونوں کے نظریے مختلف ہیں اور اس بنا پر ان کے مفادات بھی مختلف سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف تصادم کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ پُوری دُنیا جو اس تصادم کی آماجگاہ ہے۔ بحران میں مبتلا ہے۔

اسلام ثالث بالخیر ہے دونوں کو صحیح مشورہ دیتا ہے

یہ منتشر مضامین جو آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں مشوروں کے ترجمان ہیں۔ یہ فیصلہ حضرات اہلِ علم فرمائیں گے کہ حقِ ترجمانی کہاں تک ادا ہو سکا، البتہ یہ بات بلا تردّد کہی جا سکتی ہے کہ جو کچھ ترجمانی ہُوئی وہ حرفِ آخر نہیں ہے، بلکہ نقشِ اوّل ہے۔

آیاتِ کتاب اللہ کے دامنوں میں بہت سے قیمتی موتی چھُپے ہُوئے ہیں۔ اِدھر حالاتِ زمانہ بھی بدلتے رہتے ہیں تفکر اور تجسّس کی ضرورت ہے۔

نگہ بلند سخن دل نواز وجاں پرسوز وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ

نیازمند۔ محتاجِ دُعا۔

محمّد میاں

خادم درس حدیث و افتاء مدرسہ امینیہ دہلی

صدر جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی و سابق ناظم جمعیۃ علماءِ ہند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اعلیٰ اخلاق کا معلّم

سرمایہ پرستی کا دشمن، انسانیت کا حامی، شرافت کا علمبردار

(١)

سرمایہ داری کے خلاف جو کچھ کتابوں میں لکھا گیا یا سیاسی پلیٹ فارموں پر کہا گیا اس کو سامنے رکھو، پھر قرآنِ پاک کی صرف دو آیتیں پڑھو! کس شدت سے سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی ہیں۔

(١) اَلَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ وَالۡفِضَّۃَ تا تَکۡنِزُوۡنَ (سورہ توبہ ع ۵)

ترجمہ: جو لوگ سونے اور چاندی کے ذخیرے جوڑ کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو مژدہ سنا دو، دردناک عذاب کا۔ اس روز جب سونے اور چاندی کے ان ذخیروں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان (سرمایہ داروں) کی پیشانیوں، کروٹوں اور کمروں کو داغا جائے گا (اور بتایا جائے گا) یہ وہ ہے جو تم نے خاص اپنے لیے جوڑا تھا۔ اب چکھو اس کو جو تم نے جوڑ کر رکھا تھا۔ (آیت ٣٣)

(٢) لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ الخ (آلِ عمران ع ١٨)

ترجمہ: وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس (مال) میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا ہے۔ وہ ہرگز ہرگز نہ سمجھیں کہ ان کا یہ فعل ان کے لیے بھلائی کی بات ہے۔ نہیں نہیں یہ ان کے لیے بڑے شر اور بُرائی کی بات ہے۔ عنقریب قیامت کے دن یہ مال و متاع جس کیلیے

وہ بُخل کر رہے ہیں، ان کے گلوں میں (عذاب کا) طوق پہنایا جائیگا (آیت ۱۹)
مگر فرق یہ ہے کہ قرآنِ حکیم اللہ کے نام پر خرچ کراتا ہے اور سیاسی منادوں کی نظر پیٹ پر ہے، یعنی نفع اندوزی اور خود غرضی وہاں بھی اور یہاں بھی۔

(۲)

اسلام، پاداشِ عمل کا نقشہ پیش کر کے اعتدال پیدا کرتا ہے کہ مزدور اگر اقتدار حاصل کر لے، تو مُنہ چھوٹ وحشی نہ بنے اور یاد رکھے کہ اگر سرمایہ دار کا ظُلم، ظُلم تھا جس کی سزا اس کو مِلی، تو مزدور کا جبر و قہر بھی ظلم ہے، یہ بھی اس کی قدرتی پاداش سے نجات نہیں پا سکتا۔ از مکافاتِ عمل غافل مشو۔

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت　　دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

(۳)

اسلام ۔ خس و خاشاک، شجر و حجر اور انسان میں فرق کرتا ہے۔ اینٹ، پتھر اور کوڑے کرکٹ کی زندگی مشاہدہ کی حد تک ہے۔ درخت کٹ کر جل جاتے ہیں۔ اینٹ پتھر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، یہ سب زمین کی پیداوار ہیں، زمین ہی میں مِل جاتے ہیں۔ گھوڑے گدھے اور انسان میں جو فرق ہے، اسلام اس کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ جانوروں کی زندگی کا حاصل صرف پیٹ ہے یا وہ فعل ہے جس سے نسل باقی رہ سکے، لیکن انسانوں کو اسلام ایک ایسی حقیقت قرار دیتا ہے جن کا درجہ ان سب سے بلند ہے۔ زمین سے لے کر آفتاب تک اور جہاں جہاں تک مشاہدہ کی رسائی ہو سکے اسلام انسان کو، ان سب کا حاکم اور فرمانروا قرار دیتا ہے۔ انسان سے بلند صرف وہ ہے جو تمام کائنات کا خالق ہے۔

اسلام، انسان کو کائنات کا خلیفہ اور نائب السّلطنت قرار دیتا ہے۔ اسلام انسان کو ایک ایسی "حقیقتِ جاوداں" قرار دیتا ہے جو موت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ موت ایک نئی زندگی کا دروازہ یا وادیٔ حیات میں پہنچنے کا پُل ہے۔ موت فنا نہیں، بلکہ انتقال ہے

یا ارتقا ہے۔ مگر سیاسی مناد اس سلسلۂ حیات سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ ان کے نزدیک انسان شہوت پرستی کا ایک کڑوا پھل ہے جو پیٹ کے لیے پیدا ہُوا اور اسی چکّر میں فنا ہو جائے گا۔

(۴)

فطرتِ انسان، وحشت پسند نہیں۔ اس کی فطرت میں اُنس ہے۔ فطرتِ انسانی کا قیمتی جوہر محبّت ہے، اسی لیے وہ معاشرہ اور سماج بناتا ہے جس کی بُنیاد اُنس و محبّت پر ہے۔ ہمدردی، رواداری، باہمی تعاون، آپس کا اعتماد اور بھروسہ، رحم، شفقت، مروّت، مساوات، اخوّت انسانی سماج کے چہرہ کے آنکھ، ناک اور خدوخال ہیں۔ اسلام ان سب کو سامنے رکھ کر اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، مگر سیاسی منادوں کے یہاں ان سب کے جواب میں پیٹ ہے۔ ان کے تمدّن اور شہریت کا حاصل صرف عیش پسندی ہے اور راحت طلبی۔ کوٹھی، فرنیچر، موٹر، ہوائی جہاز، ایئر کنڈیشنڈ۔ کوچ، ان سب کا مقصد؟ عیش اور راحت۔

(۵)

عقل بہت بڑی دولت ہے جو انسان کو میسّر ہُوئی ہے۔ اُسی نے انسان کو جانوروں سے ممتاز کیا اور اسی عقل نے انسانی تمدّن کی زُلفیں سنواریں۔

اسلام، عقل کی قدر کرتا ہے، مگر اس سے بلند پروازی کا مطالبہ کرتا ہے، مادیات کے اُلجھاؤ میں پھنس کر نہ رہ جائے، آگے بڑھے، غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کرے، پیٹ کی کائنات کے سوا کوئی اَور کائنات بھی ہے؟ غور کرے اس کائنات سے بالا بھی کوئی اَور ہے؟

اس کائنات کا مقصد کیا ہے؟

یہ چاند تارے گھوم رہے ہیں، کیا فٹ بال کا میچ ہو رہا ہے؟ یہ پُورا نظامِ شمسی اور اب تو کہا جاتا ہے کہ ایک نظامِ شمسی ہی نہیں، بہت سے نظام ہیں، کیا یہ بساطِ شطرنج ہیں یا کسی کلب کا تماشا، کیا یہ ڈانس ہو رہا ہے؟

سُنو! ایک آواز ہے، سچّی آواز۔

سُنو! قرآن کیا کہتا ہے (قرآن کہہ رہا ہے)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ تا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(آلِ عمران ع ۲۰)

ترجمہ: آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آتے رہنے میں بڑی ہی نشانیاں ہیں اصحابِ عقل و دانش کے لیے۔ وہ اربابِ دانش جو (صرف مادیات کے گھروندہ میں گھِر کر اور قید ہو کر نہیں رہ جاتے، بلکہ اس سے بلند ہو کر اپنے خالق کو اس طرح یاد کرتے ہیں کہ کسی حال میں بھی اس سے غافل نہیں ہوتے) وہ اپنے خالق اور رب کی یاد سے بھی غافل نہیں ہوتے۔ وہ ذکر اور یادِ خدا کے ساتھ فکر سے بھی خالی نہیں ہوتے۔ وہ ان انسانوں اور زمین کی پیدائش اور تخلیق کے بارے میں غور کرتے رہتے ہیں (کیا یہ یونہی بے کار، سامانِ تفریح اور کھیل تماشہ کے طور پر عالمِ وجود میں بکھر پڑے یا ان کی پیدائش ان کے مضبوط نظام اور اس عجیب و غریب کاریگری کا کوئی مقصد ہے۔ اس ذکر و فکر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ پکار اُٹھتے ہیں) خدایا یہ سب کچھ تُو نے پیدا کیا ہے تو بلاشبہ بے کار اور عبث نہیں پیدا کیا، ضروری ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی جو اس حکمت و خوبی کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ عقلِ انسانی ہر قدم پر حیرت و استعجاب کا توشہ لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ کارخانۂ ہستی یقیناً کوئی مقصد اور غایت رکھتا ہے، یقیناً تیری ذات اس سے پاک ہے کہ بے کار اور بے مقصد کوئی کام اس سے صادر ہو۔ خدایا، ہمیں عذابِ آتش سے جو (کوتاہ نظری اور غفلت کے نتیجہ میں دوسری زندگی میں پیش آنے والا ہے) بچائیو۔

عقل کا نورِ تاباں اور جوہرِ درخشاں اگر مادیات کے ظلمات ہی میں بھٹک کر رہ گیا، اقتصادیات کے دائرہ ہی کو اس نے اپنی آخری حد بنالیا اور قومی سیاست کے جوڑ توڑ یا بین الاقوامی پالٹیکس کے گٹھ جوڑ سے آگے نہیں بڑھا نہ بڑھنے کا ارادہ کیا تو یقین کرلو کہ اچھی توفیق کی برکت اس سے چھین لی گئی۔ وہ انسانی عظمت کے اعلیٰ تقاضوں سے محروم کردیا گیا۔ اللہ نے اس کے دل پر مُہر لگادی، آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور کانوں پر ایسا کنٹوپ چڑھا دیا کہ اس کی سماعت بے کار ہو کر رہ گئی خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ط (بقرہ ع ۱) یہ کس نے کیا، خود اس نے کیا کہ اللہ کی نعمت عقلِ سلیم کو اعرج اور مفلوج بنادیا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ط (اللہ لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کرتا، لوگ خود اپنے اُوپر ظلم کیا کرتے ہیں) (سورۃ یونس ع ۵)

میدانِ انقلاب

تبدیلی کہاں کی جائے ؟

عالی شان کوٹھی کے ہرے بھرے لان کے کنارہ پر موٹر گراج کے پیچھے سرکیوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک دُبلی پتلی عورت اور اس کے تین چار چھوٹے بڑے بچّے رینگ رہے ہیں۔ کپڑے پھٹے ہُوئے، پیٹ خالی، چہروں پر ہوائیاں، اُونچی نیچی زمین ان کا فرش اور بستر ہے۔ دو بچّے اسی پر پڑے ہُوئے ہیں۔ ایک کا بدن بُخار سے تپ رہا ہے۔ دوسرے کے بدن پر چیچک کی پھنسیاں ہیں۔ ہسپتال سے اس کو خارج کر دیا گیا ہے، لیکن ابھی بہت کمزور ہے۔ کچھ پھنسیاں پک بھی گئی ہیں۔

یہ کوٹھی ایک ساہوکار کی ہے۔ یہ ایک کروڑ پتی ہے اس کے کئی مِل ہیں، فیکٹریاں ہیں، اس کا اپنا ایک بنک ہے۔ کوٹھی نہایت خوبصورت عظیم الشّان، بہت آراستہ، اس کا فرنیچر بھی لاکھ سوا لاکھ سے کم کا نہیں ہے۔ اس کے پاس کئی کاریں ہیں۔ بڑے بڑے افسروں سے اس کی دوستی ہے۔ کئی افسر لنچ کے وقت زیادہ تر اسی کے یہاں آجاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دو دفعہ ڈنر ضرور ہوتا ہے جس میں منسٹر اور اکثر باہر کے سفیر بھی شریک ہُوا کرتے ہیں۔

عورت کی وہ جھونپڑی کوٹھی کے سامنے تو نہیں ہے، لیکن جب کار گیٹ سے گزرتی ہے، تو اس کا کونہ نظر آتا ہے اور باہر سڑک پر جب اس طرف کار مُڑتی ہے، تو وہ جھونپڑی بالکل سامنے ہوتی ہے۔ سیٹھ صاحب کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے، تو گیٹ کے سنتری کو

ڈانٹتے ہیں کہ جھونپڑی کیوں نہیں ہٹوا دیتے، لیکن پھر کچھ رحم آجاتا ہے۔ چھوڑ دیتے ہیں۔
یہ سیٹھ صاحب کی مہربانی ہے۔

لیکن کیا ڈنر اور کاک ٹیل کے وقت بھی سیٹھ صاحب کو اس غریب عورت اور اس کے بچوں کا خیال آتا ہے؟ اگر ایک پلیٹ یا ایک جام کی قیمت اس غریب کو دے دیں تو اس کا پورا ہفتہ آرام سے بیت جائے، مگر سیٹھ جی کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ ان کے سینے میں دل ہے۔ یا پچھلے دنوں جو آپریشن ہوا تھا اس میں دل کی جگہ ڈاکٹر نے لوہا جوڑ دیا ہے، مگر آپریشن سے پہلے بھی ان کا دل پتھر ہی تھا جو کبھی بھی غریبوں کی ہمدردی کے لئے نہیں پسیجتا تھا

اچھا یہ سنگ دلی دولت نے پیدا کی یا دولت ان کے پاس اس لیے جڑی کہ یہ سنگ دل تھے۔ جب لوگ فاقوں مر رہے تھے۔ تو یہ غلہ کا بلیک کر رہے تھے۔ اُن کے ایک دوست نے ان سے ایک کٹھا خریدا تھا: تو انہوں نے اس سے بھی بلیک کی قیمت وصول کی تھی۔ ان کو خبر تھی کہ دوست کا باپ بیمار ہے۔ راشن کا آٹا اسے نقصان دیتا ہے۔ وہ ملاوٹ کا آٹا ہے۔ بیمار باپ کے لیے خالص گیہوں کے آٹے کی ضرورت تھی۔ دو تین کیلو میں پرہیزی کھانے کی ضرورت پوری ہو سکتی تھی، مگر یہ ایک کٹھے سے کم دینے پر راضی نہیں ہوئے تھے اور یہ کٹھا بھی انہوں نے بڑا احسان رکھ کر دیا تھا اور ان کے دوست نے مجبوراً خریدا تھا۔

مگر ہمارے سامنے ایسے بھی بہت سے دولت مند ہیں جن کا محل سرا بھوکوں ننگوں کا پناہ گاہ ہوتا ہے جن کی دولت سے بہت سے خاندانوں کے پیٹ پلتے ہیں۔ قومی کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں بہت سے طلبہ ان کے وظیفوں اور اسکالرشپ کی مدد سے تعلیمی ترقی کی اونچی اونچی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اگر یہ سنگ دلی دولت کی تاثیر ہے تو یہ اثر یہاں کیوں نہیں؟

سیاسی کھلاڑی آگے بڑھے، انہوں نے دولت کے خلاف نعروں سے آسمان

سر پر اُٹھالیا، حکومتوں کو تہہ و بالا کر دیا، فیکٹریوں پر قبضہ کیا، مزدوروں کو آزادی دی، ان کے حقوق فرض کیے اور ان میں قانون کی قوت پیدا کر دی، زمینداری ضبط کیا، تاجروں پر بڑے بڑے ٹیکس لگائے، ترقیاتی منصوبے بنائے، ان پر اربوں روپیہ خرچ کیا، مگر اس غریب دُبلی پتلی عورت کی جھونپڑی جہاں تھی وہیں رہی۔
ترقیاتی منصوبوں نے سیٹھ صاحب کی دولت میں اضافہ تو کر دیا۔ پہلے وہ فقط سیٹھ تھے، اب منسٹر بھی ہو گئے، مگر اس غریب عورت اور اس کے بھوکے بچوں کا دِلدّر دُور تو کیا ہوتا اس کی غریبی اُور بڑھ گئی۔ پہلے پچاس پیسے میں ایک وقت پیٹ بھر جاتا تھا اب ایک سو پچاس پیسوں میں بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ مزدوری جتنی پہلے مِلتی تھی، اتنی ہی اب مل رہی ہے، صرف پچیس پیسے بڑھے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ علاج غلط ہے یا تشخیص غلط ہے۔ طبیب نادان ہے یا تیمار دار غلط کار۔ اسلام کہتا ہے۔ تشخیص غلط ہے۔ طبیب نادان نے علامت کو مرض سمجھا۔ نتیجہ یہ ہُوا:

مرض بڑھتا رہا جُوں جُوں دوا کی

دولت کی بہتات اصل مرض نہیں ہے۔ اصل مرض وہ ہے جس نے دولت میں بہتات پیدا کی۔ جس کی وجہ سے چور بازاری اور سُود کی رقم کو اس نے شیرِ مادر سمجھا اور جب منسٹر ہو گیا، تو رشوت کا بازار گرم کر دیا۔ ٹھیکیداروں اور کمرشل ایجنٹوں سے اپنا کمیشن مقرر کرایا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے اصل مرض یعنی دولت کی بڑھی ہُوئی محبت، کنجوسی اور حرص و طمع۔ تم سوشلزم کا شور مچا کر اس کی دولت چھیننا چاہتے ہو۔ اس پر بھاری ٹیکس لگاتے ہو کہ وہ جو کچھ کمائے تمہیں دے دے، روپے میں صرف دو آنے اپنے پاس رکھے، چودہ آنے تمہارے حوالے کر دے۔

تم قانون بنا کر بہت خوش ہُوئے کہ سرمایہ داری ختم کر دی۔ ایک تجوری کی

رقم بہت سی تجوریوں میں پہنچا دی۔ سونے پر پابندی لگادی، افراطِ زر اور نفع اندوزی کے راستے بند کر دیئے، لیکن جب بجٹ بنایا گیا تو اربوں کا خسارہ تھا اور غریبی کے دامن پہلے سے زیادہ پھیل گئے تھے۔ جنتا کی مصیبت اور بڑھ گئی تھی، کیونکہ تمہارے قانون پر کہیں بھی ٹھیک طرح عمل نہ ہوا تھا۔

جو ساہوکار بلیک کا عادی تھا جس کو چور بازاری کی چاٹ پڑ چکی تھی، اس نے بلیک اور چور بازاری کے اور راستے نکال لیے۔ انسپکٹر صاحبان دندناتے ہوئے پہنچے۔ لیکن ۔۔ زر دیدم فولاد نرم چاندی کے پاپوش نے تمام چوکڑی بھلا دی۔ پہلے صرف سیٹھ جی بلیک کیا کرتے تھے، اب انسپکٹر صاحبان بھی ان کے مددگار ہو گئے۔ رفتہ رفتہ سکریٹریٹ اور منسٹری کو بھی اپنی برادری میں شامل کر لیا۔ یہ سوشلزم کی ترقی ہے یا بلیک ازم کی؟

اصل مرض اگر دولت اور خزانہ تھا اور سیٹھ جی اس کے مریض تھے، تو سرکاری عملہ کو کیا ہو گیا۔ یہ کیوں بیمار ہو گیا، یہ تو سرمایہ دار نہیں تھا۔

غور کرو اور سوچو، اصل مرض کیا ہے، جس نے پورے سماج کو بیمار بنا دیا۔ تم ترقیاتی منصوبوں کی آدھی مسافت طے کر چکے ہو، نتیجہ سامنے ہے۔ پندرہ سال بعد پوری مسافت طے کر چکو گے نتیجہ کیا ہو گا۔ اب اگر اصل منزل سے پچاس میل دور ہو گئے ہو تو پوری مسافت طے کرنے کے بعد سو میل دور ہو جاؤ گے۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو مے روی بترکستان است

اچھا، عرب کے ریگستان میں تقریباً چودہ سو برس پہلے ایک آواز بلند ہوئی تھی اس کی کچھ بھنبھناہٹ آج بھی کانوں میں پہنچ رہی ہے۔ بہت ہی جچے تلے اور معنی خیز الفاظ جو کانوں میں پڑ رہے ہیں ان کا تعلق اقتصادیات سے بھی ہو سکتا ہے۔ آخری فقرہ تو بہت ہی عجیب ہے۔ پوری گفتگو کا نچوڑ ہے۔ اس کا ایک ایک حرف

سونے سے لکھنے کے قابل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو سونے سے لکھا۔ غور سے سنو، سنو کیا ارشاد ہو رہا ہے۔

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ ط

(بخاری شریف صـ ۱۳)

ترجمہ: بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا (پارچہ) ہے۔ جب وہ ٹھیک ہوتا ہے، تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ دیکھو وہ قلب ہے (ضمیر کانشنس)

اسلام یہی کہتا ہے کہ اصل بیماری دولت نہیں، اصل بیماری دِلوں کی بیماری ہے۔ درستی چاہتے ہو تو دِلوں کو ٹھیک کرو، انقلاب یہاں برپا کرو۔

فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ط (سورہ حج)

ترجمہ: آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں وہ دِل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔

سب سے زیادہ مؤثر علاج ایمان بالغیب ہے۔ یہ دِل کے تمام امراض کے لیے تریاق ہے۔ یعنی یہ مت سمجھو کہ جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے بس وہی ہے جو نظر نہیں آتا اس کا وجود ہی نہیں ہے، نہیں نہیں اس کے سوا بھی ہے۔ بیج کا پودا اور پودے کا پھل اب نظر نہیں آتا، مگر وہ یقینی ہے ضرور سامنے آئے گا۔ ہمیں وہ بھی نظر نہیں آتا جو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ ہمارا ہر ایک عمل دیکھ رہا ہے۔ ہماری ہر ایک حرکت دیکھ رہا ہے۔ ہمیں اس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ ہر ایک عمل کا حساب اور ہر سوال کا جواب دینا ہے۔ یہی یقین ایمان ہے۔ اس یقین کے تقاضوں کو پورا کرنا ایمانداری ہے۔ تقویٰ کی پہلی منزل یہیں سے شروع ہوتی ہے اسی کا دوسرا نام ضمیر کی اصلاح ہے۔ یہ اصلاح ہو جائے، تو پھر ہمیں قانون کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارا عمل خود قانون ہوگا۔ قانون کی جان ہوگا۔ قانون بے اعتمادی کی دلیل ہے۔ قانون اصلاح نہیں کرتا، البتہ قوم کی خرابیوں کی چغلی کرتا ہے۔

آخری منزل ـ ملکیت کا خاتمہ

میدانِ سیاست کے مشہور شہسوار تیز دَوڑ رہے ہیں، ہانپ رہے ہیں۔ سانس پھُولے ہُوئے ہیں، دِلوں کی دھڑکنیں بڑھی ہُوئی ہیں، چہروں پر گرد ہے، ہونٹوں سے کف اُبل رہا ہے، حواس گم ہیں، پیٹ پر ہاتھ ہے چلاّ رہے ہیں کہ سیٹھ جی سے خزانہ چھین کر مزدُوروں کو دیا تھا کہ جنتا کا پیٹ بھرے، مُلک کی غریبی دُور ہو۔ اب یہ مزدُور بھی سیٹھ بن گئے، وہی رشوت بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ اور جہاں سے مِل سکے روپیہ چھیننے اور جمع کرنے کی ہَوس جو سیٹھ صاحب کی فطرت تھی مزدوروں کی طبیعت بنتی جارہی ہے۔ دولت کی گردش کو پہلے تنہا سیٹھ صاحب روکے ہُوئے تھے جس کی وجہ سے تقسیم مُساوی نہیں ہورہی تھی۔ جنتا کے ہاتھ خالی اور پیٹ بھُوکے تھے۔ نئے قانون سے سیٹھ جی کا زور ٹوٹا، لیکن نئے سیٹھوں کی نئی دُنیا جنم لینے لگی جو پہلے سے زیادہ تنگ نظر، پاپی اور زہریلی ہے۔ کیا کوئی منتر ہے کہ نئے دولت مندوں کی یہ پیدائش بند ہو۔ دولت کی تقسیم میں فرق نہ آئے اور بھُوکی جنتا کا پیٹ بھرے۔

سوال بہت ضروری تھا۔ سوشلزم کا سارا گھروندہ زمین پر ڈھیر ہُوا جارہا تھا۔ بڑے فِکر کی بات تھی۔ کانفرنس طلب کی گئی۔ ایجنڈے میں صرف یہی ایک سوال تھا کہ دولت کی تقسیم کس طرح مساوی ہو۔ جنتا کا پیٹ کیسے بھرے اور نئے سیٹھوں کی پیداوار کیسے رُکے۔ کئی روز تک بحث ہُوئی۔ دِل کھول کر تقریریں کی گئیں۔ خیالات ظاہر

کیے گئے۔ سب مقرر ایک ہی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر تقریروں میں یہی کہا گیا کہ جب تک دولت لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی، جب تک پبلک کے آدمی اپنی ملکیت جتاتے رہیں گے، دولت کی تقسیم مساوی نہیں ہو سکتی۔ اب صرف ایک ہی علاج ہے کہ ملکیت ختم کر دی جائے۔

پیداوار کے تمام ذرائع، کارخانے، مل، فیکٹریاں سب اسٹیٹ کی ہوں، پیداوار اسٹیٹ کی ہو، بلڈنگیں، مکانات، کوٹھیاں اور باغات سب اسٹیٹ کے ہوں، پھر اسٹیٹ کا کام یہ ہو کہ جنتا کا پیٹ بھرے، ان کے کھانے، پینے، رہنے سہنے کا انتظام کرے۔ ہر ایک بالغ کو، مرد ہو یا عورت کام پہ لگائے۔

تجویز مناسب تھی۔ جذبات کے موافق تھی، بالاتفاق منظور کی گئی۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی گئی، لیکن ابھی تجربہ شروع ہی ہوا تھا کہ عائلہ (فیملی) گرہستی اور خاندان کا سوال سامنے آگیا۔ ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ یہ ممکن ہے کہ ملکیت ختم ہونے کے بعد کارکردگی اور کارگزاری میں اضافہ ہو؟

(الف) انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنے نفع سے محبت ہوتی ہے۔ وہ نفع کی خاطر بسا اوقات کام زیادہ کرتا ہے، لیکن جب زیادہ محنت کا پھل اس کو نہیں بلکہ اسٹیٹ کو ملے گا، تو کیا اسٹیٹ کی محبت اور اس کی ترقی کا جذبہ اس فطری محبت اور جذبہ کی جگہ لے سکے گا؟

(ب) قابلیت کا مظاہرہ اور آگے بڑھنے کا شوق بھی اسی جذبہ کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن خاتمۂ ملکیت کے بعد جب یہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، تو قابلیت کا مظاہرہ کیوں ہوگا، اور آگے بڑھنے کے تصور میں کوئی شخص اپنی جان مصیبت میں کیوں ڈالے گا۔

(ج) ایک شخص محنت کر کے کماتا ہے، وہ اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے۔ بیوی بچوں کے اندر احسان مندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس کی بات مانتے ہیں۔ اس سے گرہستی اور خانگی نظام قائم ہوتا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو خوش رکھنے کے لیے

زیادہ کمانے کی کوشش کرتا ہے جس کے لیے زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس سے مُلک کی پیداوار اور وطن کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ باپ کو دیکھ کر اولاد میں بھی محنت کرنے اور آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی کمائی جب اس کی اپنی نہیں بلکہ اسٹیٹ کی ہوگی اور اسٹیٹ پیٹ بھرائی کا انتظام کرے گی، تو جذبات کا یہ تمام سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

تقسیم کی صورت

پھر اسٹیٹ (اس کے افراد کی ضروریات کا انتظام براہِ راست کرے گی یا اس کو فیملی کا ہیڈ یا گھر کا بڑا قرار دے کر ضروریات کا انتظام اس کے ذریعہ کرے گی، دوسری صورت میں تقسیم کس طرح مساوی ہوگی؟ کیونکہ مثلاً چالیس سال کے ایک انسان کے آٹھ بچّے ہیں اور اسی عمر کے دوسرے آدمی کے چار بچّے ہیں، تیسرے کے دو اور اسی عمر کا ایک شخص ایسا ہے جس کے اولاد ہی نہیں ہُوئی۔ یہ چاروں ایک ہی درجہ کے مزدور ہیں، مثلاً کسی فیکٹری کی ایک ہی برانچ میں ایک ہی درجہ کا کام کرتے ہیں یا کسی دفتر میں ایک ہی درجہ کے کلرک ہیں۔ تو اب ان کا الاؤنس یا وظیفہ مساوی ہوگا یا خاندان کے افراد کے بموجب کم و بیش ہوگا؟ یکساں ہونے کی صورت میں ہر ایک کا پیٹ نہیں بھرے گا، اور کم و بیش ہونے کی صورت میں ناانصافی کا شکوہ ایک نئی مصیبت بن جائے گا، اور یہ سوال زور پکڑے گا کہ کیا وجہ ہے مساوی درجہ کے ایک مزدور کو اسٹیٹ صرف اس کا خرچہ دے دوسرے کو مزید چار کا اور تیسرے کو مزید آٹھ کا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اولاد ایک کی اور خرچہ دوسرے کے ذمّے! کیونکہ اسٹیٹ صرف اولاد والے کا نہیں، پورے مُلک کا مشترک ادارہ ہے۔

(د) ایک شخص جو کچھ کماتا تھا، سلیقہ سے خرچ کرتا تھا۔ اپنے خرچ سے بچا کر ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کی بھی خدمت کرتا تھا۔ بسا اوقات پڑوسیوں

کی بھی امداد کیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ اس سے ہر ایک محبّت اور اس کی عزّت کرتا تھا اس کی عزّت کو دیکھ کر جوانوں میں بھی پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی امداد کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، لیکن جب اس کی کمائی اس کی نہیں رہی اسٹیٹ کی ہوگئی، تو ماں باپ، بھائی بہن آس پڑوس کی امداد کے تمام سلسلے ختم ہوگئے۔ آپس کی ہمدردی اور لحاظ و مروّت سب خوابِ پریشان بن گئے۔ اب انسان کو مویشیوں کے نقشِ قدم پر چلنا پڑے گا۔ اصطبل کے مالک ہر ایک گھوڑے کی رہائش خوراک اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے جو مویشی یہاں رہتے ہیں فربہ بھی ہو جاتے ہیں، اُچھلتے کُودتے بھی خُوب ہیں۔ مالک کا کام بھی کرتے ہیں، لیکن ان میں آپس میں نہ ادب اور لحاظ ہوتا ہے نہ مروّت اور پاسداری اور نہ جذبۂ ہمدردی ہوتا ہے۔

ایک مثال

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے۔ ایسے فرقے بھی گزرے ہیں جنہوں نے زر (دولت) اور "زمین" کی طرح "زن" کو بھی مشترک ملک قرار دیا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی بات ہے، اس طرح کا ایک شور برپا ہُوا تھا۔ ایک بہت بڑے لیڈر "مزدک" نے جو متاثر کرنے کے لیئے "تقدس" کا جامہ بھی پہنے ہُوئے تھا؛ چنانچہ مشہور شاہنشاہ "نوشیرواں عادل" کا باپ قباد اس کا چیلہ ہوگیا تھا۔ اس رہنمائے اعظم "مزدک" نے پیداوار اور ذرائع پیداوار اور دولت ہی نہیں، بلکہ عورت کو بھی مباح عام کر دیا تھا۔

(مِلَل و نحل (عربی) ص ۸۶ ج ۲)

"دبستان مذاہب (فارسی) کے الفاظ یہ ہیں:

"زناں را اخلاص گردانید و اموال مباح داشت۔ ہمہ مرداں را درخواستہ و زن شریک ساخت۔ چنانکہ در آتش و آب علف انبازند"

ایک عجیب و غریب دلیل یا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے :

"ستمے سنگین باشد کہ زن یک جمیلہ باشد و جفت دیگرے قبیحہ۔ پس شرطِ عدالت و دینداری آنست کہ مرد زنِ جمیلہ خود را چند روز بداں کس دہد کہ جفت او بد و زشت ست و زشت او را ایچند بخود در پذیرد"۔[1]

(دبستان مذاہب ص۱۳۴)

پیٹ کا شور مچانے والوں نے اس تاریخ سے سبق لیا۔ عورت کو گھر سے نکالا۔ کارخانے اور دفتروں میں پہنچایا۔ بچّہ اس سے لے کر سرکاری پرورش گاہ میں بھیج دیا اور اس کو زمانہ زچگی کی رخصت دے دی، لیکن جب ہر سال ولادت ہونے لگی تو زچگی کی رخصتوں میں بھی پابندی لگا دی گئی۔ مثلاً یہ کہ پانچ دفعہ سے زیادہ زچگی کی رخصت نہیں دی جائے گی۔

اب مَرد و عورت جنسی تعلقات میں آزاد ہیں، البتّہ نہ عورت ماں بنے گی اور نہ مَرد باپ۔ شاید ان کو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ ان کے جنسی تعلّقات کا جو نتیجہ تھا وہ زندہ ہے یا مُردہ؟ اگر زندہ ہے تو کہاں ہے؟ اس کا مستقبل کیا ہے؟

محبت کا سلسلہ گھر سے چلتا ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت کا ردِّ عمل اولاد کی محبت ہے۔ مِلی جُلی زندگی میں بہن بھائیوں اور رشتہ داروں میں بے لوث محبت کی شاخیں پھیلتی ہیں، لیکن جب زندگی کی پہلی ہی منزل میں یہ چمن برباد کر دیا گیا، تو اب محبت کا نام صرف عیش پرستی کی خاطر آ سکتا ہے۔ آپس کی ہمدردی، امدادِ باہمی اور انسانی شرافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا اور بقول عارف جامی انسانی سماج کی تصویر یہ ہوگی ؎

---

[1] ایک سنگین ظلم ہے کہ ایک کی بیوی خوبصورت ہو اور دوسرے کی بدصورت۔ انصاف اور دینداری کی شرط یہ ہے کہ شوہر اپنی حسین و جمیل بیوی کو چند روز کے لیے اس کو دے دے کہ اس کی بیوی بدصورت ہے اور وہ اس بدصورت کو چند روز کے لیے خود قبول کر لے۔

این نہ مردانند اینہا صورت اند
مردہ نانند کشتگان شہوت اند

کسی فریاد کرنے والے نے فریاد کی کہ ملکیت کیا ختم ہوئی فطرت کا سارا نظام ہی بدل گیا، تو جواب دیا گیا۔ فطرت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے ہیں جو پرانے زمانہ سے چلے آرہے ہیں۔ ان کی قدامت کا نام فطرت رکھ دیا گیا ہے۔ یہ آداب و اخلاق سب خیالی باتیں ہیں۔ آپ نے اپنی دلی کے مشہور شاعر استاد غالب کا یہ شعر نہیں سنا؟

ہستی کے دام میں نہ آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

انسان کی فطرت، تمدن اور اُس کی بنیاد

خاتمۂ ملکیت کا دُور رس نتیجہ

فطرتِ انسانی

کسی ایک شہر یا کسی ایک مُلک کے انسان کو نہیں بلکہ دُنیا کے کسی گوشہ کے کسی انسان کو لیجیے وہ کالا ہو یا گورا، عربی بولتا ہو یا انگریزی، اُردو یا ہندی اس کو خاندان کے رشتہ داروں سے الگ کر دیجیے، وہ اگر تنہا ہوگا، تو ہزاروں میں کوئی ایک دو ہی ایسا ہوگا جو اس تنہائی میں بھی عالی شان محل، اعلیٰ قسم کی کوٹھی یا قیمتی لباس کو تلاش کرے گا، تنہا آدمی کو کسی چیز کا شوق تو کیا ہوتا اس کو خود اپنی زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے۔ شوق کی چیزوں سے اُسے وحشت ہوتی ہے۔ آراستہ مکان کے بجائے جھونپڑی اُسے بھلی معلوم ہوتی ہے جو درختوں کے جھُنڈ یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔ تانبے، پیتل، چینی یا بلوری برتن اسے زہرِ خند معلوم ہوتے ہیں۔ معمولی پتیلی، بلکہ مٹی کی ہنڈیا، لکڑی یا لوہے کے تسلے، مٹی کے بدھنے، لوٹے، لٹیا یا تو مڑے سے کھانے پینے کی ضرورتیں پُوری کرتا ہے اور وہ انہیں کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ پیٹ بھرنے کے لیے کسی شکار کے اَدھ کچرے گوشت ورنہ کسی درخت کے پھل کو غنیمت سمجھتا ہے۔ مسہری، صوفا سیٹ یا چارپائی اس کو بے کار معلوم ہوتی ہے۔ فرشِ زمین اس کا بستر ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے لباس سے بھی اس کو نفرت ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ برہنگی پسند کرنے لگے۔

یہ بیوی بچے ہی ہیں جو اس کی طبیعت میں آرام دہ مکان اور عمدہ قسم کے فرنیچر کی طلب پیدا کرتے ہیں، سردیوں میں لحاف، توشک اور گرم کپڑوں کی تلاش ہوتی ہے وہ اپنے ہم پیشہ اور ہمسر پڑوسیوں کی نظر میں حقیر رہنا پسند نہیں کرتا تو اپنا مکان، سامان، لباس اور پوشاک بہتر بنانا چاہتا ہے۔ بچوں کے لیے بھی وضع کے مطابق اچھے کپڑے اور شوقین مزاج ہے تو فیشن کے مطابق ڈریس تیار کراتا ہے۔

بلا شبہ بال بچے اور اہل وعیال، انسان کی طبیعت میں بخل پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کو بخشش کرنے کے بجائے اپنے بیوی بچوں کی ضرورتوں کو مقدم رکھنے لگتا ہے۔

ننھے بچے اس میں یہ کمزوری بھی پیدا کر دیتے ہیں کہ اس کو اپنی جان زیادہ پیاری ہو جاتی ہے۔ وہ خطرے کے موقع سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے کہ اگر کسی فوجداری کیس میں سزا ہو جائے، تو وہ جیل میں ہوگا اور بچے گھر پر بھوکے رہیں گے۔ اگر بلوہ میں جان جاتی رہے، تو اس کی بیوی بیوہ۔ بچے، یتیم اور بے یار و مددگار رہ جائیں گے، ان کا مستقبل برباد ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ بال بچے اس میں ایثار پیدا کرتے ہیں۔ اہل وعیال کی پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے، لہٰذا وہ تن پروری چھوڑتا ہے۔ راحت و آرام کو قربان کرتا ہے۔ خدمتِ خلق کا پہلا باب یہ ہے کہ بیوی یا کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا ہے، تو وہ رات کی نیند حرام کر لیتا ہے۔ جاگنے کی تکلیف برداشت کرتا ہے تاکہ بیوی کو آرام پہنچا سکے یا بچے کو لوری دے کر سلا سکے۔

اچھے مکان، عمدہ فرنیچر، اعلیٰ قسم کے لباس کی طلب اس میں بڑھ جاتی ہے مگر اپنے لیے نہیں، بیوی بچوں کے لیے۔ وہ اپنی رفیقۂ حیات یا اپنے عزیز بچوں کو عالیشان محل، شاندار کوٹھی اور بہترین باغیچہ میں رکھنا چاہتا ہے۔ عموماً یہی اس کا مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔

بیوی کو نازک قیمتی اور سب سے نئے ڈیزائن کے زیورات سے آراستہ کرنے کی خاطر وہ متاع جان لٹانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے جب وہ نئی قسم کے عجیب عجیب کھلونے بازار سے لاتا ہے اور بچوں کو ان سے کھلاتا ہے۔ بچوں کا لباس صاف ستھرا اور عمدہ ہو، غذا بہتر ہو، کھانے پینے کے برتن اچھے ہوں۔ باہر جانے آنے کے لیے ان کے پاس گاڑی ہو۔ یہی چیزیں اس کی رات دن کی محنت اور جانفشانی کا نصب العین بن جاتی ہے۔

اس کی یہ محبت، یہ خوشی اور زندگی کا یہ نصب العین اگرچہ انفرادی ہے اور خاص اپنے گھر کے حلقے میں محدود ہے، مگر کیا اس سے تمدن میں اضافہ نہیں ہو رہا؟۔ شہریت کی عمارت بلند نہیں ہو رہی؟ صنعت و حرفت کی سطح اونچی نہیں ہو رہی؟ اور انسانی دماغ نئی ایجادات میں مصروف رہ کر ملک، وطن اور اپنی قوم کو آگے نہیں بڑھا رہا؟

بے شک محبوبۂ حیات اور ننھے بچوں کی محبت نے اس کو بزدل بنا دیا وہ اپنی حفاظت کا زیادہ اہتمام کرنے لگا۔ اس کو اپنی زندگی سے جو پیار پہلے تھا اب وہ بڑھ گیا، لیکن اگر کسی وقت بال بچوں پر آنچ آئے، تو کیا اس کے دل کی تڑپ یہ نہ ہوگی کہ وہ اپنے اہل و عیال کی جان اور ان کی آبرو بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ یہ جذبہ دفاع کی پہلی منزل ہے جو اس کو دفاع کی آخری منزل کا راستہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی قوم وطن اور ملک کی حفاظت کے لیے ہنسی خوشی جان دینے کے واسطے تیار ہو جاتا ہے اور اس کو معمولی بات سمجھنے لگتا ہے کہ اپنی دولت خرچ کر کے یا اپنے ذرائع کام میں لا کر وطن اور ملک کی دفاعی طاقت کو مضبوط کرے۔

آپ نے دیکھا قرابت، رشتہ داری اور خانگی نظام کا اثر صرف ایک فرد کی انفرادی زندگی تک محدود نہیں رہا وہ آگے بڑھا اور تعمیر و ترقی کے ہر ایک شعبہ پر چھا گیا۔

یہ تمام شاخیں اسی ایک جڑ کی ہیں جس کو قرآن نے نسب اور صہر کہا ہے یعنی صلبی اولاد کا سلسلہ ہو کہ انسان کے بچّے ہوں یا اس کے ماں باپ کی اولاد ہو، یا ازدواجی رشتہ ہو کہ اس کا کوئی داماد ہو یا یہ کسی کا داماد ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات ہیں جو صرف افزائشِ نسل کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی سماج کے پُورے تمدن کی اصل بنیاد ہیں۔

بڑے بڑے شہروں کی سر بفلک عمارتوں، عالی شان محلّات کی اُونچی اُونچی برجیوں اور بڑی بڑی فیکٹریوں کی دیو قامت چمنیوں کی تمام بلندیاں، آبادیوں اور شہروں کی چہل پہل، بازاروں اور منڈیوں کی تمام رونق ان سب کی بنیاد اس اینٹ پر ہے جس کو فیملی، خاندان، گرہستی یا عیال داری کہا جاتا ہے جس کو قرآن نے نسب اور صہر کے دو لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

آپ عیال داری کے بار کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نسب اور صہر کی نعمت کو ٹھکراتے ہیں، تو آپ تعمیر و تمدّن کی یہ جنّت اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہے ہیں۔

تمثیل

ایک انسانی جوڑے کو بہترین باغ، سکونت کے لیے دے دیا گیا۔ اس کو ہر طرح کا آرام تھا۔ صرف ضرورت ہی کی نہیں، بلکہ آرام و آسائش، لباس و پوشاک اور زیب و زینت کی بھی تمام چیزیں نہایت افراط کے ساتھ فراہم تھیں۔ اس جوڑے کو مکمّل آزادی تھی کہ جس طرح چاہے اور جو چاہے کھائے پیے۔ جس چیز کو چاہے اپنے کام میں لائے۔ صرف اور صرف ایک پابندی تھی کہ اس درخت کے پاس نہ جائے۔ اس کا پھل اس کے لیے ممنوع ہے۔

ایک عرصہ گزر گیا یہ جوڑا یہاں نہایت آرام اور چین کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہر طرح کے عیش و آرام کا جو سامان مہیّا تھا، اس کے علاوہ بھی اس کی نازبرداری یہاں

تک کی جارہی تھی کہ جس چیز کی وہ آرزو کرتا تھا نہ صرف آرزو، بلکہ جس کا وہ تصوّر کرسکتا تھا وہ نعمت بھی وہاں موجود ہوجاتی تھی۔

اس جوڑے کو یہاں کی سکونت ایسی محبوب تھی کہ اس نے چاہا کہ یہ قیام عارضی نہ رہے، دائمی بن جائے۔

اس کے سب سے زیادہ عزیز اور بہترین دوست بھی اسی باغ کے قریب رہا کرتے تھے۔ ان کی محبّت نے اس کی اس تمنّا میں اَور اضافہ کردیا کہ وہ اس باغ میں ہمیشہ ہمیشہ رہ سکے، اور اس کو دوام اور خلود میسّر آجائے۔

اس جوڑے کا ایک دشمن بھی تھا جو بظاہر دوست تھا۔ اس کی باتیں بہت میٹھی ہوتی تھیں۔ وہ دلفریب اداؤں کا ماہر تھا۔ وہ بہترین ایکٹر تھا۔ اُس کی پوشیدہ خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو اس جوڑے کو اس باغ سے نکال دے؛ چنانچہ اُس نے پھسلانا شروع کیا۔ عجیب و غریب منطق اور نہایت شیریں گفتگو سے اس جوڑے کے ذہنوں میں یہ بات جمادی کہ اس درخت کا پھل کھانے سے اس لیے ممانعت کی گئی ہے کہ ان کو اس باغ میں دوام میسّر نہ آجائے۔ یہ امر پھل کا درخت ہے جو شخص اس کا پھل کھالیتا ہے وہ امر اور اٹل ہوجاتا ہے۔ پھر وہ اس باغ سے کبھی نہیں نکل سکتا اور وہ اپنے عزیز دوستوں سے بھی جُدا نہیں ہوسکتا جو اس کے پڑوس میں ہیں۔

اس نے یہ باتیں اس طرح سمجھائیں کہ اس جوڑے کو یقین آگیا اور اس نے دوام اور خلود یعنی اس باغ کے دائمی پٹہ کے شوق میں یہ پھل کھالیا جس کا حقیقی اثر اُلٹا تھا۔ جو اس کا پھل کھالیتا تھا اس کا مزاج فوراً بدل جاتا اور اس میں وہ جراثیم پیدا ہوجاتے تھے کہ اس باغ کی پاکیزہ آب و ہوا ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی، نہ باغ کا مالک گوارا کرتا تھا کہ اس بگڑے ہوئے مزاج کے انسان کو اس باغ کی صاف ستھری فضا میں رہنے دے۔

چنانچہ اس جوڑے نے جیسے ہی یہ پھل کھایا، باغ سے نکلنے کے آثار شروع

ہو گئے۔ اعلیٰ قسم کا لباس چھن گیا۔ اپنی برہنگی پر ان کو شرم محسوس ہوئی، تو پتوں سے بدن ڈھانپنے لگے۔ پھر مالک نے ان کے اخراج کا حکم صادر کر دیا؛ چنانچہ ان کو یہاں سے کوسوں دُور پھینک دیا گیا۔

آج جو لوگ ملکیت کو ختم کر کے خاندانی سلسلہ کو غیر فطری قرار دے رہے ہیں کیا وہ ایسی زندگی کو دعوت نہیں دے رہے ہیں جہاں تمدن کا نام نشان نہ ہو اور انسان وحشی جانوروں کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں کو اپنا مسکن بنائے۔

اگر مادر پدر سے آزاد کر کے بچوں کی پرورش جنرل وارڈوں میں ہونے لگے تو ان کی اگلی یا اگلی سے اگلی نسل کی دلچسپیاں صرف جنسی خواہشات میں محدود ہو جائیں گی جن کو وہ آبادیوں کی بجائے جنگلوں میں آزادی سے پورا کر سکیں گے۔

ممکن ہے کوئی صاحب اسی کو فطرتِ انسانی قرار دیں، مگر پہلے ان کو اس بات کا ثبوت دینا ہوگا کہ ان کے دماغ میں خلل نہیں ہے، اور ان کا مزاج صحیح ہے۔

یرقان زدہ سفید کو زرد ہی دیکھتا ہے، لیکن یہ اس کی نظر کی خرابی ہوتی ہے۔ بیمار آدمی میٹھے کو کڑوا کہنے لگے تو اس سے مٹھاس کی فطرت نہیں بدل جاتی۔ دُنیا ایسے مریض کی تصدیق نہیں کرے گی، بلکہ اس کو علاج کرنے کا مشورہ دے گی اور اس کے حق میں سب سے بڑی خیر خواہی یہی ہو گی کہ اس کو کسی نرسنگ ہوم میں داخل کیا جائے۔

تمثیل سابق اور قرآنِ حکیم

جوڑے اور باغ کی مثال جو اُوپر بیان کی گئی قرآن حکیم میں اسی طرح کی تمثیل کے بعد فرمایا گیا ہے:

(۱) اے اولادِ آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا کہ جسم کی ستر پوشی کر سکتا ہے (اور دیکھو ایک اور لباس بھی بخشا یہ) پرہیزگاری

اور تقویٰ کا لباس ہے جو تمام لباسوں سے بہتر لباس ہے یہ اللہ کے (فضل و رحمت) کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ نصیحت پذیر ہوں۔ (جزء ۷، آیت ۲۴، ۲۵ - اعراف ع ۲)

پہلا لباس جو زمین کی پیداوار سے تیار ہوا وہ جسم کی حفاظت کے لیے ہے، بڑھتے ہوئے تمدن کی جائز آرائش بھی اس سے حاصل کرو، اور دوسرا لباس روح کی حفاظت کے لیے ہے (۲) اے اولادِ آدم عبادت کے ہر موقع پر اپنے جسم کی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو، نیز کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزر جاؤ۔ خدا انہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے ہیں (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں کس نے حرام کی ہیں تم کہو یہ نعمتیں تو اسی لیے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں۔ دُنیا کی زندگی میں (مکروہات اور کش مکش کے ساتھ) اور قیامت کے دن (ہر ایک پریشانی اور کش مکش سے) خالص اور نکھری ہوئی۔

(دیکھو) اس طرح ہم ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو، میرے رب نے جو کچھ حرام ٹھہرا دیا وہ تو یہ ہے کہ:

(۱) بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر کی جائیں اور جو
(۲) چھپا کر کی جائیں۔
(۳) گناہ کی باتیں۔
(۴) ناحق کی زیادتی اور یہ کہ
(۵) خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند

نہیں اتاری اور یہ کہ خدا کے نام پر ایسی بات کہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ (سورہ اعراف، ع ۴، ج ۷، آیت ۳۳-۳۰)

(۶) اے اولادِ آدم (دیکھو) کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا اور ان کے لباس اُتروا دیے تھے کہ ان کے ستر ان کو دکھا دے۔ وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے۔

(اعراف۔ ع ۳، ج ۷، آیت ۲۶)

قرابت اور رشتہ داری کی اہمیت
اور
خاتمۂ ملکیت کے تمدن کُش نتائج

(۱) رحمٰن، اللہ کا نام ہے (بہت مہربانی کرنے والا) قرآنِ پاک کی سب سے پہلی سورت میں رَبِّ الْعَالَمِیْن کے بعد اَلرَّحْمٰن ہی آیا ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ o اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کسی بھی اچھے کام کو شروع کرتے وقت بِسْمِ اللّٰه پڑھی جاتی ہے تو "اللہ" کے ساتھ یہ نام (اَلرَّحْمٰن) بھی لیا جاتا ہے۔

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ"

قرآن شریف میں ہر سورت کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھی جاتی ہے اور تلاوت کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

رحم کے معنی مہربانی ہیں اور عربی میں رشتہ داری کو بھی رحم کہا جاتا ہے۔ "ذی رحم" رشتہ دار۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لفظ رحمٰن کو درخت سے تشبیہ دیتے ہُوئے نہایت ہی لطیف اور مُؤثر پیرایہ میں رحم اور قرابت کی وہ حیثیت بیان فرمائی ہے جو اسلامی تعلیمات میں اس کو حاصل ہے۔ بڑے درخت کی جڑیں بھی شاخیں ہوتی ہیں جن کو "بیل" کہا جاتا ہے۔ یہ زمین کے اندر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور ان کا جال دار سلسلہ زمین کی رگوں میں گندھا ہُوا دُور تک چلا جاتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اَلرَّحِمُ شَجۡنَۃٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ

یعنی لفظ رحمٰن کو ایک درخت فرض کیا جائے تو یہ سمجھو کہ رحم اور قرابت اسی درخت کی جالدار بیل ہے۔ اس کی تفسیر یا تاثیر خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ میں یہ ہے:

مَنۡ وَصَلَكَ وَصَلۡتُهٗ وَمَنۡ قَطَعَكَ قَطَعۡتُهٗ (بخاری شریف)

ترجمہ: جو تجھ سے جوڑے میں اُس سے جوڑوں گا جو تجھ سے توڑے میں اُس سے توڑوں گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے رشتہ داری اور قرابت کو جو شجرِ رحمت کی ایک بیل ہے۔ یہ ضمانت دے دی ہے کہ جو تجُھ کو (یعنی رحم و قرابت) کو جوڑے گا اور اس کے حقوق ادا کرے گا۔ اس سے اللہ تعالیٰ بھی امداد و اعانت اور رحم و کرم کا رابطہ قائم رکھے گا اور جو رشتہ داروں سے توڑے گا اور ان سے بُرا سلوک کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے اپنے فضل و کرم کا رابطہ منقطع کرے گا۔

(۲) انسانی زندگی کا ایک سِرا خالق سے جُڑا ہُوا ہے، دوسرا مخلوق سے جس کی ابتدا ماں باپ سے ہوتی ہے۔

اسلام کا حقیقت پسندانہ مطالبہ یہ ہے کہ انسان خالق کے حق میں انصاف اور خودداری سے کام لے (جو خالق نہیں ہے اس کو خالق نہ قرار دے جو خدا نہیں ہے اس کے آگے گردن جھکا کر اپنی خودی کو ذلیل نہ کرے) دوسری طرف ماں باپ کا احسان مان کر احسان کا بدلہ احسان سے دے۔

وقضیٰ ربك ان لا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا (بنی اسرائیل ع ۳)

تمہارے رب نے یہ فیصلہ کر دیا (اور یہ بات ٹھہرا دی) کہ اس کے (خالق کے) سوا کسی کی بندگی نہ کرو، اور یہ کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ ۱۷/۲۳

اس آیت کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ احسان بالوالدین، کو مطالبہ توحید کے ہمدوش کر دیا گیا ہے۔

(۳) احسان اور حسن سلوک کا سلسلہ ماں باپ سے بڑھ کر بہن بھائیوں اور تمام رشتہ داروں تک پہنچتا ہے اور اسلام نے پڑوسیوں کا بھی وہی حق مقرر کیا ہے جو رشتہ داروں کا، فرق صرف یہ ہے کہ کچھ رشتہ دار وارث بھی ہوتے ہیں اور پڑوسیوں کو ترکہ میں حصہ نہیں ملتا۔ (صحاح)

پڑوسی، رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں اور اجنبی بھی۔ پھر کچھ اجنبی (غیر رشتہ دار) وہ ہوں گے جن سے آپ کی دید و شنید ہے۔ آپ کے مجلسی دوست ہیں یا ان سے کوئی اور تعلق ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان تمام تعلقات کو ایک لڑی میں پرو کر اس خوبصورت تسبیح (مالے) کو عبادتِ خداوندی کی محراب میں آویزاں کر دیا ہے۔ عبادت صرف خدا پرستی کا نام نہیں رہا، بلکہ ان حقوق کا احترام بھی عبادت کا جزو بن گیا۔

سورہ نساء کے رکوع ۵، آیت ۳۶ میں روحانی اور جسمانی تعلقات کا سنگم ملاحظہ فرمائیے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا (تا) عَذَابًا مُّهِيْنًا ط

ترجمہ: اللہ کی بندگی کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک رکھو (اسی طرح) قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور پڑوسیوں کے ساتھ خواہ وہ رشتہ دار پڑوسی ہوں، خواہ اجنبی ہوں (جن سے خاندانی رشتہ نہ ہو) اسی طرح پاس کے اُٹھنے بیٹھنے والے دوست (جو رشتہ نہیں رکھتے) اور ان کے ساتھ جو مُسافر ہوں اور وہ لونڈی غلام جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔ ان سب کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک سے پیش آؤ۔

اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترانے والے اور ڈینگیں مارنے والے ہیں جو خود بھی بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنا سکھاتے ہیں اور جو کچھ خدا نے اپنے فضل و کرم سے دے رکھا ہے (اُسے خرچ کرنے کے بجائے چھپا کر رکھتے ہیں (یاد رکھو) ان لوگوں کے لیے جو ہماری نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں ہم نے رُسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۴/۳۶)

یہاں رشتہ اور قرابت کے حقوق و فرائض بیان کرنے مقصود نہیں ہیں مقصد صرف یہ ہے کہ صرف سماج اور معاشرہ کا یہ گلدستہ جو حسین پھولوں سے آراستہ ہے جو فطری طور پر تمدن اور تعمیرِ عالم کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسلام جو امنِ عالم اور صالح تعمیر و تمدن کو ایک اہم مقصد اور نصب العین قرار دیتا ہے اور فرد کی زندگی کو مطمئن اور خوش گوار بنانا چاہتا ہے وہ اس گلدستہ کو زیادہ سے زیادہ شاداب اور تر و تازہ رکھنا چاہتا ہے۔

مذہب تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب کا اتحاد نہ ہو تو ایک دوسرے کا وارث بھی نہیں ہوتا۔ قانونِ اسلام نہ کسی مسلمان کو غیر مسلم رشتہ دار کا وارث بناتا ہے نہ کسی غیر مسلم کو مسلمان کے ترکہ کا مستحق قرار دیتا ہے، لیکن جہاں تک قرابت اور رحم کا تعلق ہے وہ حُسنِ سلوک کو ہر حالت میں لازمی قرار دیتا ہے۔ ماں باپ نے اگر آپ کی دعوت قبول نہیں کی، تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ ان حقوق سے محروم ہو گئے جو زندگی میں ان کو ماں یا باپ ہونے کی حیثیت سے ملنے چاہئیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ (الآیۃ سورہ لقمان ع ۲ آیت ۱۵)

ترجمہ: اگر ماں باپ تجھ سے اس بات پر جہاد کریں یعنی جملہ وسائل و ذرائع اور تمام طاقت صرف کر کے اس بات پر اصرار کریں کہ کسی ایسے

کو میرا (خداوند عالم کا) شریک گردان لو۔ جس کا کوئی علم (کوئی ثبوت) تمہارے پاس نہیں ہے تو ماں باپ کی یہ بات نہ مانو اور اس سلسلہ میں ان کی اطاعت مت کرو۔ البتہ جہاں تک آپس کے معاملات اور رہن سہن کا تعلق ہے تم ان کے ساتھ بھلی طرح اور اس دستور کے مطابق رہو جو ماں باپ کے ساتھ رہنے کا جانا بوجھا طریقہ ہے (لقمان ۳۱/۱۵)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جس شدّت اور قوّت کے ساتھ صلح، آشتی اور رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ صحابہ حُسنِ سلوک کو بھی ایمان کا جزو سمجھنے لگے تھے اور یہ بات ذہنوں میں پختہ ہو گئی تھی کہ اسلام سے برگشتہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے رشتہ داروں کے حق میں بھی بدسلوکی پر اُتر آئیں۔ ایک طرف صلح اور آشتی چھوڑ کر ملک میں فساد برپا کریں۔ تعمیر و تمدن کو نقصان پہنچائیں۔ دوسری جانب خود اپنوں کے گلے کاٹیں، جیسا کہ ماضی میں یہ سب کچھ کرتے رہے تھے۔

فھل عسیتم ان تولیتم (سورۃ محمدؐ ع ۳)

ترجمہ: اے مسلمانو! اگر تم اسلام سے برگشتہ ہوتے ہو تو کیا پھر ایسا نہ ہوگا کہ ملک میں فساد برپا کرنے لگو اور رشتوں اور ناتوں کو توڑو (برادر کشی کرو اور آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹو) ۴۷/۲۲

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صلح پسندی اور بلا امتیاز دین و مذہب رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور حقوقِ قرابت کی پاسداری اس درجہ مشہور اور مسلّم تھی کہ رومۃ الکبریٰ کے شہنشاہ (ہرقل) کے دربار میں خود اس کی طلب پر جب قریش کے سربرآوردہ نمائندے پیش ہوئے اور اس نے ان سے دریافت کیا کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم جو نبوّت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھے بھی اسلام کی دعوت دی ہے) وہ کیا بتاتے ہیں تو ابوسفیان جیسے دُشمن اسلام کا بھی بے ساختہ جواب یہ تھا:

یامرنا بالصلوٰۃ والصدق والعفاف والصلۃ

ابوسفیان قریشِ مکّہ کے سردار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حریف تھے۔ اس گفتگو سے تقریباً تین سال پہلے غزوہ احزاب کے مشہور معرکہ میں اسلام کے برخلاف عرب کی متحدہ فوجوں کی کمان انہیں کے ہاتھ میں تھی جب شہنشاہِ ہرقل نے ان سے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات معلوم کیں، تو جواب دیتے وقت اس حقیقت کو کسی طرح بھی نہیں چھپا سکے کہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہمیں نماز کی ہدایت کرتے ہیں اور ہمیں سچائی، پاک دامنی اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کی تعلیم دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ (۱) خاتمۂ ملکیت اگرچہ ایک بسیط عمل ہے کہ ایک فرد کو آپ تہی دست کر دیتے ہیں؛ مگر اس کا نتیجہ ہمہ گیر تباہی، بربادی؛ وحشت اور بربریت ہے۔

(۲) اہل وعیال اور خاندانی نظام۔ اگرچہ ایک فرد کی زندگی کے لیے سکون ومسرت کا سامان ہوتا ہے، مگر فی الحقیقت وہ پورے تمدن کے لیے سنگِ بنیاد ہے۔

اسلام کی دُور رس نگاہ نے اس کی افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور اس وجہ سے اس نے رحم اور قرابت کو وہ حیثیت اور اہمیت بخشی کہ مطالبہ توحید کے بعد سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے: بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ط

اور اعلان یہ ہے؛ جو رشتہ داروں سے جوڑتا ہے وہ خدا سے جوڑتا ہے جو ان سے توڑتا ہے وہ خدا سے توڑتا ہے۔

مادی ترقیات
اسلام کی نظر میں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآنِ پاک کی چند آیتیں پیش کر دی جائیں جو مادی اور بالفاظ دیگر سائنسی ترقیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مگر اس تمہید کے ساتھ کہ اسلام جس طرح تمدن کو انسانیت کا طرۂ امتیاز قرار دیتا ہے۔ جس طرح وہ تعمیر و ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ایسے ہی وہ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا کہ انسان تمدّن اور مادی ترقیات کی چکا چوند میں اس سے غافل ہو جائے جس نے اس کو وجود بخشا اس کو جذبۂ ترقی ودلیعت فرمایا۔ پھر ترقی کے راستے بتائے۔ اس راستہ پر چلتے ہوئے انسان نے جو کچھ مانگا اور انسانی استعداد و صلاحیت نے ارتقاء کی جس منزل میں جس ضرورت کی فرمائش کی فطرت کے لازوال خزانوں نے اس کی طلب پوری فرمائی۔

غذا کے لیے پیداوار کی ضرورت تھی۔ پیداوار کے لیے ہوا، پانی، دھوپ اور مناسب گرمی اور لباس کے لیے کپاس، اُون اور ریشم کے کیڑے پیدا کیے۔ لکڑی، بانس، نرسل وغیرہ کے بے شمار خود رَو جنگل اور حجری دَور سے گزر کر جب انسان نے لوہے کی ضرورت محسوس کی تو نہ صرف لوہا، بلکہ تانبے، پیتل اور سونے چاندی کے معادن کا راستہ انسان کو بتا دیا۔ انتہا کہ مشینی دَور آیا، اور مشینی دَور نے کوئلے، تیل، پٹرول اور گیس کا مطالبہ کیا، تو قدرت نے وہ خزانے سامنے کر دیے جو ابتدائے آفرینش سے زمین کے کلیجے میں سر بمہر تھے۔ سمندروں اور دریاؤں نے وہ جوہر حوالہ کر دیا جس کا نام بجلی ہے جو کبھی

بادلوں میں رہا کرتی تھی۔ جس کو انسان دیوتا سمجھتا تھا وہ انسان کی غلام بنا دی گئی۔

مختصر یہ کہ کلامِ الٰہی (قرآن) ان ترقیات کو قدرت کا حریف نہیں قرار دیتا۔ وہ قدر کرتا ہے کہ انسان نے رموزِ قدرت کو پہچانا، البتہ تمدن و ترقی کی حوصلہ افزائی کے لیے وہ پیرایۂ بیان اور وہ تعبیر اختیار کرتا ہے جس سے انصاف، حقیقت پسندی، خداشناسی اور منعمِ حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اُبھرتا اور نمودار ہوتا رہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ (تا) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ

(سورۂ ابراہیم۔ رکوع ۵) ۱۴/۳۲ تا ۳۴

ترجمہ: یہ اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو۔ اور آسمان سے پانی اتارا۔ جس سے پیدا کیا پھلوں کو تمہاری غذا اور رزق کے لیے، اور مسخر کر دیا تمہارے لیے جہازوں کو (تاکہ اس کے حکم سے اس کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) سمندر میں چلیں، اور مسخر کر دیے تمہارے لیے دریا۔ اور مسخر کر دیا تمہارے لیے آفتاب اور چاند کو (ان کے لیے وہ قانونِ فطرت مقرر کر دیا جس پر علومِ انسانی اور اس کی تحقیق و دریافت کی بنیاد ہے۔ اسی قانون کے ماتحت سورج اور چاند) برابر چلتے رہتے ہیں، اور مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو (غرضکہ) جو کچھ تم نے اپنی صلاحیت اور استعداد کی ترقی کی بموجب مانگا سب اس نے عطا فرما دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی تم ان کو پوری نہ گن سکو گے اور ان کا احاطہ نہ کر سکو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناانصاف اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔

موجودہ سائنس کے ماہرین کو فخر ہے کہ ان کے راکٹ چاند کو چھونے لگے، مگر قرآنِ پاک اشارہ کر رہا ہے کہ صرف چاند ہی نہیں، بلکہ سورج اور انتہا کہ یہ دن اور رات

کو بھی تمہارے لیے مسخّر کر دیا گیا ہے۔ ترقی کی منزلیں ابھی ختم نہیں ہوئیں آگے بڑھو اور آگے بڑھو، البتہ تقاضائے انصاف یہ ہے کہ اس کو نہ بھولو جس نے سب کچھ بنایا اور تمہارے لیے بنایا۔"

اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک

(تا) لقوم یتفکرون (جاثیہ ۴۰ ۱۲ و ۱۳)

ترجمہ: وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے قابو میں کر دیا سمندر کو تاکہ اس کے اندر تم بحکمِ خدا جہاز چلاؤ اور دُور دراز ممالک سے تعلقات قائم کرکے) اللہ کا فضل (منافع) حاصل کرو اور خدا کا شکر ادا کرو (اور نہ صرف سمندر) بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ان سب کو تمہارے لیے مسخّر کر دیا (تمہارے لیے ممکن اور جائز کر دیا کہ جس کو چاہو (وہ چاند ہو یا سُورج یا دوسرے سیارے یا ان کے علاوہ اور کوئی چیز جہاں تمہاری رسائی ہو سکے) اس کو اپنے تصرف میں لاؤ! بیشک اس میں بہت سی دلیلیں ہیں ان کے لیے جو فکر سے کام لیتے ہیں (اور کائنات کے رازہائے سربستہ پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ (سورہ جاثیہ۔ ۱۲ و ۱۳)

انسان کس طرح مانگتا ہے

سائنس کا سب سے بڑا محقق ہو یا سیاست اور پالٹیکس کا سب سے بڑا ماہر کسی جمہوریہ کا صدر ہو یا کسی فوج کا سب سے بڑا کمانڈر اور فیلڈ مارشل۔
جب وہ پیدا ہوا، تو گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا تھا۔ اس کے پاس علم اور واقفیت کا کوئی سرمایہ تھا تو صرف اتنا کہ وہ رونا اور چیخنا جانتا تھا۔
مگر غور کرو اور انصاف سے کام لو، یہی گوشت پوست کا لوتھڑا یہی متحرک

اور چیخنے والا ننھا سا وجود کیا سراسر سوال نہیں تھا؟

کیا وہ گڑگڑا کر التجا نہیں کر رہا تھا کہ اس کی بقا و حفاظت اور نشو و نمو کا انتظام کیا جائے۔ اس کا کمزور معدہ ٹوسٹ اور مکھن کا متحمل نہیں ہو سکتا اور انڈے کی زردی بھی برداشت نہیں کر سکتا، وہ گاڑھا دودھ بھی ہضم نہیں کر سکتا۔

کیا قدرت نے اس کی گڑگڑاہٹ اور یہ التجا نہیں سنی اور اس کی پیدائش سے پہلے اس کا انتظام نہیں کر دیا؟

اس کی ماں کے اندر یہ تڑپ کس نے پیدا کی کہ وہ بچے کو چھاتی سے لگائے اور گود میں لٹائے۔ ماں کی مامتا نے جو جگہ بچے کے ماتھے اور چہرہ کے لیے تجویز کی، جہاں بچے کو سب سے زیادہ سکون ملتا تھا وہیں اس کے لیے دودھ کے دونے کس نے بھر کر رکھ دیے؟

یہ جو قدرت نے سینۂ مادر میں بچہ کی تڑپ پیدا کر دی اور دودھ کے دونے بھر کر ان کے ٹونڈے ایسے بنا دیے جو ربڑ کی چوسنی سے بھی زیادہ نرم اور بچہ کے ننھے سے منہ کے چھوٹے سے سائز کے ٹھیک ٹھیک برابر ہیں۔ کیا بچہ کی فطرت نے ان کی مانگ نہیں کی تھی؟

گرمی اور سردی سے حفاظت درجہ بدرجہ غذا کی تبدیلی۔ ہر موقع پر محبت، شفقت اور امداد و اعانت کا ایک طویل سلسلہ جو اس وقت تک چلتا رہا جب تک بچہ کو ضرورت رہی اور خود چلنے پھرنے اور اپنے کام کرنے کے قابل نہیں ہوا۔

تو کیا ہر ایک اسٹیج پر، ہر موقع اور ہر ایک مرحلہ پر اس کی فطرت غیر شعوری طور پر سائل بن کر سامنے نہیں آتی رہی؟ اور کیا اس کا ہر ایک سوال اور مطالبہ پورا نہیں ہوتا رہا؟

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۚ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (سورۂ ابراہیم ع ۵ آیت ۳۲ و ۳۴)

ترجمہ: دیا تم کو جو کچھ تم نے اس سے مانگا۔ اور اگر اللہ کی نعمتیں گنا چاہو تو نہیں گن سکتے۔ (لیکن) حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناانصاف اور بڑا ہی ناسپاس ہے۔ $\frac{۱۴}{۳۴-۳۲}$

یہ ایک فرد کی زندگی کی مثال ہے۔ اب نوع انسان کی زندگی پر غور کیجیے اس کا عہدِ طفولیت کس طرح گزرا، وہ بچپن سے جوانی تک کس طرح پہنچا۔ اس کی فطرت نے ہر موقع پر کس طرح دستِ سوال دراز کیا، اور جس داتا نے اس کو وجود بخشا تھا اس کی دین نے ہر ایک اسٹیج پر کس طرح اس کی مانگ پوری کی۔ غور کرو گے تو فرد کی زندگی کا نقشہ یہاں بھی سامنے آئے گا۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (سورہ روم)

انقلاب کی کہانیاں
اور
اسلامی نظریات

دُنیا انقلابات کی آماجگاہ ہے۔ چھوٹے بڑے مُلکوں میں انقلاب ہوتے رہتے ہیں۔ مصر میں فوجی انقلاب ہُوا۔ شاہ فاروق بھاگ کر جان بچا سکے۔ اصلاح پسندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

شمالی افریقہ کے ایک کروڑ عربوں نے فرانس کی منظم فوجوں کا مقابلہ کیا۔ تقریباً پندرہ سال تک خُون کی ندیاں بہتی رہیں۔ دس لاکھ عرب قُربان ہو گئے۔ آخر قاتل کو ہاتھ روکنا پڑا، الجزائر آزاد ہو گیا۔

ہندوستان میں عدم تعاون اور "مقاومت بالصبر" (ستیہ گرہ) کا تجربہ کیا گیا۔ تقریباً تیس سال تک اس منفی پالیسی پر عمل ہوتا رہا۔ برطانوی اقتدار کو بازو سمیٹنے پڑے۔ ہندوستان میں کانگریس کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ سیاسی انقلابات ہُوئے۔ وہ ہاتھ بدل گئے جن اُنگلیوں میں حکومت کی باگ ڈور تھی، مگر کیا وہ اصلاحات بھی جاری ہو گئیں جن کے نام پر یہ انقلاب کیے گئے تھے۔

جمہوریت کا جائزہ

آج کی دُنیا میں جمہوریت کا سکّہ رائج ہے۔ کہا جاتا ہے یہی بہترین نظامِ حکومت ہے۔ ہمیں اس کو چیلنج کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ کیا جمہوریت اصلاحات کا نام ہے؟

اگر جمہوریت اور اصلاحات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں تو ہندوستان میں جیسے ہی جمہوریت قائم ہوئی۔ غریبی دُور ہو جاتی، اقتصادی مساوات قائم ہو جاتی۔ اُونچ نیچ کا نام نہ رہتا، چھوت چھات ختم ہو چکی ہوتی، لیکن ۴۲ سالہ تجربہ اس کی تردید کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے ابھی اُور انقلاب کی ضرورت ہے۔

ضمنی انقلاب اور سبز باغ

ہر ایک جمہوریہ میں انتخاب کے وقت ہر ایک پارٹی مینوفسٹو شائع کیا کرتی ہے، وہ پارٹی کے نظریات، منصوبوں اور ان کے لیے لائحہ عمل در پروگرام کا خاکہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہ مُلک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے پارٹی کن باتوں کو ضروری سمجھتی ہے اور ان کو عمل میں لانے کے لیے پارٹی نے کیا صورتیں تجویز کی ہیں۔

بلاشبہ یہ مینوفسٹو ایک جاندار معاہدہ ہوتا ہے، بشرطیکہ مینوفسٹو کے مصنّفین خود بھی جاندار ہوں۔ اور قوم میں بھی عمل کرنے کی جان ہو۔ اور اگر مینوفسٹو کے مصنّفین قوّتِ عمل سے اور قوم حوصلہ اور ہمّت سے محروم ہو تو یہ مینوفسٹو سبز باغ یا خیالی پلاؤ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

سیّد الکونین حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سرزمینِ عرب کی غیر متمدن اور نیم وحشی قوم میں ایک انقلاب برپا کیا تھا۔

الف بےسے لے کر اس انقلاب کی ی کی انتہا تک ساڑھے بائیس سال صرف

ہُوئے تھے اور اس وقت سے حساب لگایا جائے جب مدینہ منورہ میں آکر جماعتی زندگی کی داغ بیل پڑی تھی تو صرف دس سال میں یہ تحریک یا دعوت ایسی مکمل اور کامیاب ہوگئی تھی کہ خود رسالت مآب حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کا بھی اُس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

آنحضرت سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں اس تحریک کے جو پودے اُگے تھے وہ خلیفۂ اوّل اور دوم کی زندگی میں سرسبز اور تناور درخت ہو گئے۔ پھر خلیفۂ سوم کے دورِ خلافت کے ابھی چھ سال پُورے نہیں ہُوئے تھے کہ یہ درخت ایسے بار آور ہو گئے اور باغ ایسا سرسبز ہوگیا کہ سینکڑوں برس تک اس کی سرسبزی اور شادابی میں فرق نہیں آیا۔

جس طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مقدسہ میں نہ کوئی اندرُونی خلفشار اس کی ترقی کو روک سکا تھا اور نہ کوئی بیرونی دباؤ رکاوٹ بن سکا تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد بھی سخت سے سخت اندرُونی اور بیرُونی مقابلوں کے باوجود اس کی ترقی روز افزوں رہی۔ انتہا یہ کہ صرف ۱۰۸ سال کے عرصہ میں اس وقت کی متمدن دُنیا اس کے اقتدار کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ ایک بڑا حصّہ اس کی مملکت میں داخل ہوگیا جہاں چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی اس کا اقتدار قائم ہے (اگرچہ وہ اپنے اصل مقصد سے بہت دُور ہٹا ہُوا ہے)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس دعوت کی بنیاد پر سیاسی انقلاب بھی برپا ہُوا اور سماجی اور اقتصادی دُنیا بھی بدل گئی۔ کیا مناسب نہ ہوگا کہ اس کے بُنیادی نظریات اور طریقۂ کار کا تجزیہ کیا جائے۔

اسلامی نظریات اور لائحہ عمل

سب سے پہلے اپنی پہچان

مُبارک ہیں وہ انسان جو کسی انقلاب انگیز فیصلے سے

پہلے خود اپنے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں۔
انسان مخلوق ہے یا خالق ؟
انسان آزاد ہے یا مملوک ؟
انسان کی حیثیت اس کائنات میں کیا ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں ؟
یہ زندگی کیا ہے اور اس کے بعد کیا ؟
مابعد الموت کا اس زندگی سے کیا تعلّق ہے ؟

انقلاب کا مقصد اگر اصلاح ہے، تو پہلے حدود قائم کیجیے۔ پھر انقلاب کی طرف قدم بڑھائیے، ورنہ انقلاب اصلاح نہیں ہوگا، انارکی اور انتشار ہوگا، جس کو قرآنِ حکیم "فساد فی الارض" کہتا ہے۔

انسان

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان اپنا خالق خود نہیں ہے۔ وہ پیدائش کے وقت تو اپنی تخلیق کیا کرتا، بڑھاپے کے قریب پہنچنے کے بعد جب وہ رموزِ کائنات کے پردے چاک کر کے حقیقت کی سب سے گہری تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے، اپنے پورے وجود کی نہیں، بلکہ اپنے وجود کے کسی معمولی سے حصّہ کی بھی تخلیق نہیں کر سکتا۔

بال بڑھانے، بال اُگانے، بال جمانے، بالوں کو سیاہ یا نرم کرنے والے تیلوں اور پوڈروں کے اشتہارات تو اکثر رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن آج تک کوئی اشتہار ایسا شائع نہیں ہوا جس میں قدرت اور فطرت کے مقابلہ پر بال بنانے کا دعویٰ کیا گیا ہو۔

یعنی مشین میں تیل یا پٹرول کی نلکی بند ہو گی تو اس کو کھولنے کی ترکیب اور اس کے اشتہار تو شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن پٹرول پیدا کرنے اور اس کو نیست سے ہست کرنے کی نہ طاقت اب تک مہیّا ہو سکی ہے نہ اس کا کوئی اشتہار شائع کیا جاتا ہے۔

مملوک

ایک کمہار مٹی کے برتن بناتا ہے۔ اگرچہ مٹی اُس نے نہیں بنائی، مگر مٹی سے جو برتن بنایا ہے، دُنیا بھر کی ہر ایک عدالت کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ بنایا ہُوا برتن کمہار کا ہے، کمہار اس کا مالک ہے اور یہ برتن اُس کا مملوک۔ اس کو اختیار ہے کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یا فروخت کر دے یا توڑ کر پھینک دے۔ اس کا ہر ایک تصرّف قانوناً جائز ہوگا، کیونکہ یہ برتن اس کی مِلک ہے۔ یہ اس کا صنّاع ہے اور وہ مصنوع۔

جب مخلوق مملوک ہوتا ہے اور خالق مالک تو کیا انسان کا خالق اس کا مالک اور انسان اس کا مملوک نہ ہوگا، جبکہ انسان دستکاری کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کو وجود کا جامہ پہنایا گیا ہے اور اگر انسان اپنی مملوکیت سے انکار کرے اور اپنے خالق کو اپنا مالک نہ مانے تو کیا یہ نفرت انگیز بغاوت اور توہین آمیز سرکشی نہ ہوگی۔

بلاشبہ ایک صاحبِ عقل و فہم کی یہ سرکشی اور سرتابی دُنیا کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اگر عمر بھر یہی ظلم کرتا رہا تو اس نے ظلم کی ایسی مثال قائم کر دی جو کم از کم اس کے حق میں ناقابلِ تلافی ہے۔

حیثیت

انسان صرف حیوانات سے بلند نہیں، بلکہ پُوری کائنات میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے، اسی لیے اس کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اسکی اس حیثیت کو تسلیم ہی نہیں کیا، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام قرار دیا ہے کہ عالمِ مشاہدہ کی ہر ایک چیز اس کے لیے مسخّر کر دی۔ یہاں تک کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ قرار دیا، مگر اس سے وہ اقتدار جو خالق کو مخلوق پر ہے ختم نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان، خالق کا مملوک بھی ہے اور اس کی کائنات پر اس کا خلیفہ اور اس کی طرف سے انچارج بھی ہے۔

عالمِ مشاہدہ کی ہر ایک چیز اگر انسان کے چارج میں دے دی گئی ہے، تو اس

سے انسان اور کائنات کی اس حقیقت میں فرق نہیں آتا کہ انسان اپنے خالق کی مِلک ہے اور جو اس کے چارج میں ہے یا زیرِ اقتدار ہے وہ بھی مالک حقیقی کی مِلک ہے۔

شہاب الدّین غوری نے دہلی کو فتح کیا اور اپنے زرخرید غلام قطب الدین ایبک کو نائب السلطنت بنا دیا۔ اب اگر قطب الدّین ایبک بغاوت کرتا، تو اس سے بڑا غدار، احسان فراموش، ظالم اور پاپی کون ہو سکتا تھا۔

بہرحال قرآنِ پاک کا اعلان یہ ہے کہ انسان ایک ایسی بلند حقیقت ہے جس کو عالمِ مشاہدہ اور کائناتِ ارضی کی ہر ایک چیز پر وہ اقتدار حاصل ہے جو ایک نائب اور خلیفہ کو مالک کی طرف سے ہونا چاہیے، لیکن جبکہ انسان مخلوق ہے تو نائب السلطنت ہونے کے باوجود وہ اپنے خالق کا مملوک ہے۔

مستقبل کیا ہے؟

ہر ایک ذی ہوش اپنا فرض سمجھتا ہے کہ مستقبل کو بہتر بنالے، بلکہ ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت کی رات دن یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل کامیاب اور روشن ہو۔

مگر مستقبل کیا ہے؟

ایک فرد کا مستقبل وہ ہے جو حال کے بعد شروع ہوگا اور موت پر ختم ہو جائے گا یا حقیقی مستقبل وہ ہے جو مرنے اور انتقال کر جانے کے بعد شروع ہوگا اور اس وقت تک باقی رہے گا جس کی حد اور انتہا کے لیے اعداد و شمار پیش نہیں کیے جا سکتے۔

یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے اس کے نتائج نہایت دُوررس اور ہمہ گیر ہوتے ہیں، اس سوال کا جواب گویا انسانی جدوجہد کا قطب نما ہوتا ہے جو انسانی سعی اور کردار و عمل کا رُخ معیّن کرتا ہے۔

کلام اللہ شریف کی خاص ہدایت ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ

مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (سورہ حشر ع ۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہیے کہ دیکھے ہر ایک جی (شخص) اس نے کیا بھیجا کل کے لیے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۚ (سورہ حشر ع ۴)

ترجمہ: اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ خبر رکھتا ہے ان سب کی جو تم کرتے ہو۔

اس ایک فقرہ میں ایک عمل کے لیے دو مرتبہ اللہ سے ڈرتے رہنے اور تقوے کی ہدایت کی گئی ہے اور عمل یہ ہے: وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ دیکھ لے (غور کر لے) ہر شخص اس نے کیا بھیجا ہے کل کے واسطے (مستقبل کے لیے کیا مہیا کیا ہے)

کوئی بھی انسان گوارا نہیں کرتا کہ اس کو کیڑے مکوڑے یا گھوڑے گدھے کی حیثیت دی جائے۔ انسان اپنے آپ کو ان سب سے بلند سمجھتا ہے۔ اسلام انسان کے اسی احساس کو بیدار کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حوصلہ بلند کرے۔ وہ اللہ کا خلیفہ ہے وہ اپنی اہمیت اور عظمت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے فرائض پہچانے اور ان کو انجام دے۔ وہ ایک غیر فانی حقیقت ہے۔ وہ نظر کو وسیع کرے۔ وہ اس دارِ فانی کے نہایت محدود دائرہ کو نصب العین نہ بنا لے۔ اس کا مقام یہ چند روزہ زندگی نہیں ہے جس کو "الحیاۃ الدنیا" کہا جاتا ہے، بلکہ اس کا مقام وہ ہے جس کو "الآخرۃ" کہا جاتا ہے۔

اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۚ (سورہ مؤمن ع ۵)

وہی گھر جو پچھلا ہے وہی ٹھہراؤ کا گھر ہے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ (عنکبوت ع ۷)

پچھلا گھر۔ وہی ہے اصل زندگی۔

بحران کیوں پیدا ہوتا ہے

امراض کی تشخیص اور علاج

ایک طرف دولت کے بے شمار انبار۔ عیاشی۔ تن آسانی۔ سنگ دلی اور جبر و قہر دوسری طرف ناقابلِ تصوّر مفلسی۔ لرزہ خیز غربت اور فاقہ کشی، محنت و مشقت، مجبوری اور لاچارگی۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ عدم توازن اور اس کے باعث جو بحران پیدا ہوتا ہے یقیناً ناقابلِ برداشت ہے اس کو ختم ہونا چاہیے۔ خود ختم نہ ہو تو ختم کرنا چاہیے، مگر یہ دیکھو کہ اس کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور ان کا خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے دولت اور ملکیت کو اصلی سبب قرار دیا ہے۔ یہ نظر و فکر کی کوتاہی ہے۔ آپ کی نظر ظاہری سطح سے آگے نہیں بڑھی۔

نظر و فکر کی اسی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ جس اطمینان و سکون، خوشحالی اور فارغ البالی کی خاطر آپ نے انقلاب پر انقلاب برپا کیے۔ بہت سی سوسائٹیاں بے شمار خاندان ان کی لپیٹ میں آکر تباہ و برباد ہو گئے۔ بہت سے مذہب بہت سے مکاتب خیال ملیا میٹ ہو گئے۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے خون کی ندیاں بہہ گئیں، لیکن وہ اطمینان و سکون میسر نہ آیا جس کی طلب تھی۔ خوشحالی اب بھی عنقا ہے۔ فارغ البالی کے لیے اب بھی دِل ترس رہے ہیں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ اس عدم توازن اور بحران کے بیج سیاست اور اقتصادیات کی سطح پر جمے ہوئے ہیں اس سطح کو پلٹ دیں گے تو بحران ختم ہو جائے گا۔ اسلام کہتا ہے

کہ یہ کوتاہی نظر ہے، اس عدمِ توازن کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ بُحران جلدی مرض نہیں ہے کہ کریم یا پوڈر سے یہ مرض جاتا رہے گا اور انسانیت کا چہرہ خوش نما ہو جائے گا۔

اس سرطان کی جڑیں دِلوں کی رگوں تک پہنچی ہُوئی ہیں۔ یہ امراض صرف سیاسی اور اقتصادی نہیں بلکہ بگاڑ اخلاق میں پیدا ہُوا ہے۔ اخلاق کے بگاڑ نے دِلوں کو بگاڑ دیا ہے اور دلوں کے بگاڑ نے اکتناز، احتکار، نفع اندوزی، چور بازاری، رشوت اور خیانت کی وبا پھیلائی ہے۔

اسلام کہتا ہے اور قرآنِ حکیم اس کی بہت سی مثالیں پیش کرتا ہے کہ اصل مرض چار ہیں۔ ان امراض کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ دولت جیسی نعمت سراسر مصیبت بن جاتی ہے اور سیاست اس کے گرد چکر کاٹنے لگتی ہے۔

مرض یہ ہیں:

(۱) عدمِ معرفت (خود کو نہ پہچاننا) یا حقیقت ناشناسی یعنی وہ خود اپنی حقیقت اور حیثیت سے غافل رہتا ہے۔ وہ اس تحقیق و معرفت کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ مخلوق ہے یا خالق اور جب وہ مخلوق ہے تو لامحالہ خالق کا مملوک اور اس کا زیرِ فرمان ہو گا۔

(۲) بخل (۳) حرص و طمع اور خود غرضی قرآنِ حکیم نے ان کے لیے ایک جامع لفظ "شح" استعمال کیا ہے۔

(۴) اتراف۔ تعیّش پسندی اور تن آسانی، یعنی خود کوئی ایسی محنت نہ کرنا جس سے قوم کو فائدہ پہنچے یا مُلک کی دولت میں اضافہ ہو اور دوسروں کی محنت کو عیش پرستی اور نہایت اُونچے معیار کی زندگی پر قربان کر دینا۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (الآیۃ (سورہ اسراء ع ۲)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (سورہ قصص ع ۶)

اسلام کہتا ہے کہ ان امراض کے باعث صرف یہی نہیں کہ وہ بحران پیدا ہوتا ہے جو خرمن امن واطمینان پر برق بن کر گرتا ہے اور دُنیا کے چین اور سُکھ کو بھسم کر دیتا ہے، بلکہ ان بیماریوں اور ان علتوں کا اثر خود دولتمندوں پر یہ ہوتا ہے کہ ان کا تمام عروج شان وشوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ایک طلسم بن جاتا ہے جس کے پیچھے حقیقت نہیں ہوتی۔ اس ریشمی نقاب کے پیچھے عموماً خوف وہراس، بے اعتمادی اور پریشانی کے بھُوت مُنہ چھُپائے رہتے ہیں۔

اور جہاں تک اس زندگی کا تعلق ہے جو انسان جیسے اشرف المخلوقات کی حقیقی زندگی ہے، تو وہ موت سے بدتر ہوگی اور ایسی بدتر کہ موت کی تمنّا کرے گا۔ ہر طرف اس کو موت دکھائی بھی دے گی، مگر موت سے محروم رہے گا۔ تمنّائے موت پُوری نہ ہوگی۔

"جَبَّارٌ عَنِيْدٌ" وہ شخص ہے جس میں اُوپر لکھے ہُوئے مرض اپنا پُورا اثر کر چکے ہوں۔ قرآن حکیم میں اس کی اُخروی زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (سورہ ابراہیم ع ۳)

ترجمہ: اس کے پیچھے دوزخ ہے (یعنی دُنیا کی نامُرادی کے بعد آخرت کی نامُرادی پیش آنے والی ہے) وہاں خُون اور پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ وہ ایک ایک گھونٹ کر کے منہ میں لے گا اور گلے سے اُتار نہ سکے گا۔ ہر طرف سے اس پر موت آئے گی، مگر مرے گا نہیں۔ اس کے پیچھے ایک سخت عذاب لگا ہُوا ہے۔ ۱۴ / ۱۶-۱۷

اسلام کہتا ہے کہ جب اصل بیماریاں یہ ہیں تو ان کا علاج سیاسی یا اقتصادی

پھر یریوں سے نہیں ہو سکتا۔ ان کا علاج یہ ہے کہ دِلوں کی دُنیا میں انقلاب برپا کیا جائے اور قانون کے راستہ سے نہیں بلکہ تربیت کے راستے سے ایسے متبادل اخلاق کی فضا تیار کی جائے جو اطمینان و سکون، انس و محبت، رواداری اور باہمی ہمدردی کیلیے سدابہار ہو۔

انسان اور فریضۂ تربیت

اسلام نے جس طرح انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ جنگل کی خود رد گھاس نہیں ہے بلکہ اپنے رب اور اپنے خالق کے وصف پروردگاری کا ایک شاہکار ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ؕ اسلام نے جس طرح انسان کو یہ بتایا کہ اس کے خالق نے اپنی تمام مخلوق سے اس کا درجہ یہاں تک بلند کیا ہے کہ شرف خلافت و نیابت سے نوازا۔ بر و بحر پر اس کی عظمت کا سکہ جمایا۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (سورۂ بنی اسرائیل)

اسی طرح اسلام نے اس کو یہ بھی سبق دیا اور حکم فرمایا کہ اس سبق کو بار بار دُہرائے کہ وہ خالق جس کی نیابت و خلافت اس کو حاصل ہے وہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ اور رب العالمین ہے اس کی رحمت کا دامن پُورے عالم پر پھیلا ہُوا ہے۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (الاعراف ع ۵)

بلکہ اس عالم کا وجود اس کے وصف رحمت ہی کا پر تو ہے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (سورۂ طٰہٰ ع ۱)

وہ صرف دولتمندوں کا نہیں صرف انسانوں کا نہیں بلکہ تمام عالم کا رب اور پروردگار ہے۔ اس رب العالمین کا اعلان ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا (سورہ ہُود ع ۱)

ترجمہ: زمین میں جو بھی پاؤں چلنے والا (جان دار) ہے اس کا

رزق اللہ کے ذمہ ہے اور وہ جانتا ہے اس کا ٹھکانا اور وہ جگہ جہاں
اس کا وجود بالآخر سونپا جائے گا۔ (11/6)
نائب کا فرض ہے کہ مالک کے اعلان کو پورا کرے اور اسی اعلان کے پیش نظر
اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نقشہ تیار کرے اور پروگرام بنائے۔

بیشک تمام مخلوق کا رزق آپ فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا
کی مخلوق کہاں کہاں رہتی ہے۔ اس کا طریقۂ رہائش اور اس کی زندگی کا انداز کیا ہے۔
مگر جن کو تم جانتے ہو، جن کی بود و باش کا تمہیں علم ہے ان کے حق میں ارحم الراحمین
اور پروردگارِ حقیقی کا نائب بن کر ان پر رحم و کرم اور ان کی پرورش تو آپ کا فرضِ منصبی
ہو جاتا ہے۔ ہر ایک فرد پر لازم ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دے۔ فرد اگر قاصر رہتا
ہے، تو جماعت اور سماج کا فرض ہے کہ اس منصبی فرض کو انجام دے اور اس کے
تقاضوں کو پورا کرے۔

اگر دل کا کھوٹ، اخلاق کی خرابی، اس فرض کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتی ہے تو
ہر شخص کا خود اپنا فرض ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے، اور اگر فرد کوتاہی کرتا ہے تو جماعت
اور سماج کا فرض ہے کہ اس کو بیدار کرے۔ کھوٹ اور گراوٹ کو دور کر کے مستعد اور
چست بنائے۔ بخل اور طمع جیسے امراض کو دور کر کے اس میں داد و دہش، سخاوت اور
بخشش کی خصلت پیدا کرے۔ سخت مزاجی اور سنگ دلی کو دور کرے اس کو غریبوں
اور کمزوروں کا ہمدرد بنائے۔

اسلام جب خود اپنے بارے میں جبر و اکراہ پسند نہیں کرتا وہ دل کی آواز کا انتظار
کرتا ہے تو ان مسائل میں بھی جبر پسند نہیں کرے گا، بلکہ دلوں کے انقلاب کو نصب العین
بنائے گا۔

ہم جھنڈے اور یونیفارم کے رنگ کو انقلاب کی علامت قرار دیتے ہیں۔ اسلام
کہتا ہے سب سے پہلی بات دل کی رنگت ہے۔ اس کو للّٰہیت اور اخلاص کے رنگ
میں رنگ دو تو ہر ایک رنگ ٹھیک ہو جائے گا۔

صِبۡغَةَ اللّٰہِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبۡغَۃً ۔

ترجمہ: ہم نے رنگ لیا اللہ کا اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر؟

تلوار کی قوت سے گردنیں جھکائی جا سکتی ہے، دِلوں کو رام نہیں کیا جا سکتا اور جب تک دِل رام نہ ہوں جذبات ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔

قانون بھی تلوار ہی کا ایک رُوپ ہے، دِلوں کو یہ بھی نہیں بدلتا۔ ہاں نفاق کے بیج بو دیتا ہے جس پر چور بازاری، اسمگلنگ اور رشوت وغیرہ کے پھل لگتے ہیں، البتہ اگر دِل تربیت یافتہ یا تربیت کے قدرداں ہوں تو قانون بہترین مشیر اور مددگار بن جاتا ہے۔

پس کامیاب انقلاب وہ ہے جو دِلوں کی تبدیلی کا نتیجہ ہو۔ اسلام یہ غلط راستہ نہیں اختیار کرتا کہ جہاں دِلوں کے بدلنے کی ضرورت ہو وہاں تلوار ہاتھ میں لے۔

لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ

اسلام کا اصولِ کار یہ ہے کہ دِلوں کو بدلنے میں وعظ و پند اور ترغیب و تربیت کی پُوری طاقت صرف کی جائے اور بخل و طمع جیسے بدترین اخلاق کی جگہ جود و عطا صدقہ و زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی جائے۔

دِلوں کی تبدیلی

خَلقِ خُدا کی سچّی ہمدردی

غریبوں کی ہمدردی کے نعرے ہماری زبان پر ہوتے ہیں۔ موقع مِل جاتا ہے تو کسی غریب کی اتفاقی موت کو بھی "بھوک مری" کہہ کر آسمان سر پر اُٹھالیتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار جماعت کو بدنام کریں۔

کبھی ہم غریبوں کو مُفت غلّہ تقسیم کرتے ہیں، کبھی سستے غلّہ کی دُکانیں کھُلواتے ہیں کہ غریبوں کی مدد ہو، لیکن منشا یہ ہوتا ہے کہ اس طرح سے پارٹی کی شہُرت اور مقبُولیت ہو کبھی خود اپنے کاروبار کی ترقی ہمارا نصب العین ہوتی ہے، کبھی اپنی شہرت کے لیے ایسے کام کرتے ہیں۔

اس طرح اگرچہ ہم نے غریبوں کو کچھ فائدہ پہنچا دیا، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے دِل بدل گئے دل ہرگز نہیں بدلے۔

سچ یہ ہے کہ دِلوں کے مندروں میں خودغرضی کی مورتیاں اُسی طرح براجمان ہیں، ہم اُن کی پُوجا کر رہے ہیں۔ ہم غریبوں کی ہمدردی نہیں کر رہے ہیں۔

دِلوں کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ دِل و دماغ پر اس ذمہ داری کا احساس چھایا ہُوا ہو جو رب العالمین کا نائب اور سارے عالم کے پالن ہار کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے رب العالمین کا خلیفہ اور ساری مخلوقات میں سب سے اشرف ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا احساس ایسا بیدار ہو کہ ضرورتمند کی ضرورت ہمارے دِل کی ٹیس اور چبھن ہو۔

اپنی ذاتی غرض یا پارٹی کے مفاد کے لیے نہیں، بلکہ دِل کی اُس چبھن کو دُور کرنے کے لیے ہم ضرورت مند کی امداد کریں۔ ہماری انفرادی امداد اسی بنیاد پر ہو اور جماعتی امداد کا محرک اور پس منظر یہی مخلصانہ جذبہ ہو کہ ہم خلیفۃ اللہ ہیں۔ اس لیے منجانب اللہ غریبوں کی حاجت روائی کے ذمّہ دار ہیں۔ یہ ہماری ڈیوٹی اور فرضِ منصبی ہے۔ بلاشبہ یہ بہت اچھا کام ہے مگر اس لیے نہیں کہ لوگ ہماری شان میں قصیدے کہیں یا ہماری خدمت میں سپاسنامے پیش کریں۔ اگر ہم قحط زدہ فاقہ مستوں کی خوراک کا انتظام کر رہے ہیں تو ہمارے دِل کی صدا یہ ہونی چاہیے:

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا۔

ترجمہ: ہم تمہارے لیے خوراک کا انتظام اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ذمہ داری پُوری کر سکیں جو اللہ نے ہم پر لازم کی ہے۔ ہم تم سے قطعاً کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ ہمارا معاملہ خدا سے ہے اور خود اپنا مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں خوف اس کا ہے کہ اپنے رب اور اپنے پالن ہار کی طرف سے کہیں وہ دن نہ دیکھنا پڑے جو نہایت سخت اور نہایت تلخ ہوگا۔ $\frac{۷۶}{۹-۱۰}$

اخلاص وللّٰہیّت

مذہب کی زبان میں اس کا نام اخلاص ہے اور جب کہ یہ عقیدہ کارفرما ہو کہ ہمارا یہ فرض منجانب اللہ ہے اور ہم خدا کے عائد کردہ فرض کو انجام دے رہے ہیں تو اس اخلاص نیت کو للّٰہیّت کہتے ہیں۔

شہرت پسندی

انسان کا عمل چھپا نہیں رہتا اور جب آپ آگے بڑھ کر کارِ خیر میں حصّہ لیں

گے تو آپ کی شہرت لازمی طور پر ہو گی، مگر یہ قطعاً نظر انداز اور ناقابلِ التفات چیز ہونی چاہیے، لیکن اگر شہرت کو نصب العین بنا لیا، تو من کی مُورتی کی پُوجا شروع کر دی جو ایک طرح کا شِرک ہے۔

اور یہ تو قطعاً غلط ہے کہ آپ کسی وقت ان غریبوں سے اپنا کوئی ذاتی مقصد حاصل کریں اُن پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں یا ذاتی شہرت و نام و نمود آپ کا مقصد ہو۔ یہ غریب نوازی اور خدا پرستی نہیں بلکہ خود غرضی اور خود پرستی ہے۔ اس سے سب کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ کسی شخص نے اُس مٹی میں بیج بکھیر دیے، جو کسی چٹان پر جم گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بارش برسی، تو نہ وہ بیج رہے، نہ مٹی رہی۔ خالی چٹان رہ گئی۔

چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔ اسلامی نظریات کی تصویر آپ کے سامنے آ جائے گی۔

> جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور (اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ) اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں نہ لینے والے کو (اپنے قول و فعل سے) کسی طرح کا دُکھ پہنچاتے ہیں (یا دباؤ ڈالتے ہیں) تو ان کے پروردگار کے نزدیک اُن کے عمل کا اجر ہے، نہ تو ان کے لیے کسی طرح کا خوف نہ کسی طرح کی غمگینی، سیدھے مُنہ سے ایک اچھا بول۔ اور (رحم و شفقت سے) عفو و درگذر کی کوئی بات اس خیرات سے کہیں بہتر ہے۔ جس کے ساتھ (خدا کے بندوں کے لیے) کوئی اذیت ہو اور (دیکھو یہ بات، نہ بھُولو کہ) اللہ تعالیٰ بے نیاز اور صاحبِ حکمت ہے۔
>
> مُسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور لوگوں کو اذیت پہنچا کر برباد نہ کر دو جس طرح وہ آدمی برباد کر دیتا ہے جو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

مال خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، سو ایسے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان اس پر مٹی کی ایک تہہ جم گئی (اور اُس میں بیج بویا گیا) جب زور سے پانی برسا، تو مٹی بہہ گئی اور بیج کو بھی ساتھ بہا کر لے گئی اور) ایک صاف اور سخت چٹان کے سوا کچھ باقی نہ رہا (سو یہی حال ان ریا کاروں کا بھی ہے) انہوں نے (اپنے نزدیک خیر خیرات کر کے) جو کچھ بھی کمایا تھا وہ (ریاکاری کی وجہ سے) رائیگاں گیا۔ کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ لگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر (فلاح اور سعادت کی) راہ نہیں کھولتا جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

(برخلاف اس کے) جو لوگ اپنا مال نمود و نمائش کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں (کیونکہ وہ اللہ کے خلیفہ اور نائب ہیں اپنا فرض محسوس کرتے ہوئے اپنے دِل کے جماؤ کے ساتھ خرچ کرتے ہیں تو ان کی مثال ایسی ہے جیسے اُونچی زمین پر (جو ترائی میں نہیں ہے) کوئی باغ ہو اس پر پانی برسا تو چند پھل پھول پیدا ہو گئے، اور اگر زور سے پانی نہ برسا، تو ہلکی بوندیں بھی اسے شاداب کر دینے کے لیے کافی ہیں اور (یاد رکھو) تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی آدمی بھی یہ بات پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں کے درختوں اور انگوروں کی بیلوں کا باغ ہو اس میں نہریں بہہ رہی ہوں۔ نیز اس میں اور بھی ہر طرح کے پھل پھول پیدا ہوتے ہوں، پھر ایسا ہو کہ جب بڑھاپا آجائے اور ناتواں اولاد اس آدمی کے چاروں طرف جمع ہو (جو اس کی عمر بھر کی ہری بھری باغ باڑی ہے)، تو اچانک ایک جھلستی ہوئی آندھی چلے اور آن کی آن میں) یہ

باغ جل کر ویران ہو جائے ۔ اللہ تعالیٰ ایسی مثالوں کے پیرایہ میں تم پر (حقیقت کی) نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ غور و فکر سے کام لو۔

سورۂ بقرع ۳۶ ۲۶۱ تا ۲۶۶

اس تمثیل میں خیرات کو بارش سے اور زمین کو دِل سے تشبیہ دی گئی ہے. اگر زمین ٹھیک ہے یعنی دِل میں اخلاص ہے، تو جس قدر بھی عملِ خیر کیا جائے گا پھل لائے گا۔ اور اگر زمین درست نہیں ہے یعنی ہمدردی کا وہ جذبہ نہیں ہے جو بتقاضائے انسانیت و خدا پرستی ہوتا ہے، تو کتنی ہی دکھاوے کی خیرات کی جائے سب رائیگاں جائے گی ۔ یہی معنی ہیں دِل کی تبدیلی کے کہ اس میں غریبوں اور ضرورت مندوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ اُبھر آئے جو ہر مصیبت زدہ کا ہمدرد و غم خوار ہو اور اس کی مصیبت کو خود اپنی مصیبت اور اس کے دُکھ کو اپنا دُکھ بنا دے ۔ ایک خدا ترس و خدا پرست بزرگ (حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ) کا ارشاد ہے :

(۱)
بنی آدم اعضاء یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

(۲)
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار

(۳)
تو کز محنت دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

ترجمہ : (۱) آدم کی اولاد ۔ (تمام انسان) ایک دوسرے کا عضو (بدن کا حصّہ) ہیں، کیونکہ ایک جوہر سے ان سب کی پیدائش ہوئی ہے ۔

(۲) اگر زمانہ (گردشِ وقت) کسی ایک عضو کو درد میں مبتلا کر دیتی ہے، تو بدن کے دوسرے حصّوں کو بھی چین و قرار نہیں رہتا ۔

(۳) تم اگر دوسروں کی محنت (مشقّت و مصیبت) سے بے غم ہو تو درست نہیں ہے کہ تمہارا نام آدمی رکھیں (اور تمہیں انسان کہا جائے)

ایک جادو بھرا فقرہ دِلکش و دِلدوز مگر خطرناک

زندگی کا معیار بلند کرو

بڑی اچھی بات ہے جو ہمارے رہنما اور سربراہ کہا کرتے ہیں کہ "زندگی کا معیار بلند کرو"۔ اور جب ہمارے منسٹر صاحبان یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہماری رات دِن کوشش یہی ہے اور تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد یہی ہے کہ عوام کی زندگی اُونچی ہو اور ان کا معیار بلند ہو" تو ہمارے دِل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ سوکھی رگوں میں تری آجاتی ہے اور امنگوں کی مُرجھائی ہوئی کلیوں میں بھی تازگی آنے لگتی ہے۔

نفسیاتی طور پر اس فقرہ کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ وزراء عالی مقام کا معیارِ معیشت اوچھل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب ہر ایک کی معیشت کو اسی معیار پر لانا ہے، تو چڑھانے اور بلند کرنے کی کوشش تو کی جائے گی اور جو بلند ہو چکے ہیں ان کو اتارا نہیں جائے گا۔

ہمارے لیے درست نہیں ہے کہ ہم اپنے لیڈروں اور رہنماؤں کی نیت پر شبہُ کریں۔ بے شک وہ خیر اندیش، خیر سگال اور نیک نیت ہیں وہ عوام کے لیے یہی سوچتے ہیں اور اسی لیے اُونچے معیار کی زندگی کی ترغیب دیتے ہیں، مگر بے جا نہ ہوگا کہ ہم ان الفاظ کے اثرات پر غور کریں۔

اور جب کہ ہماری کوششیں مستقبل کے لیے تخم کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہم ایک ترقی پذیر قوم کی تعمیر میں مصروف ہیں، تو ہمارے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ جو بیج ہم بکھیر رہے ہیں ان کا پھل کیا ہوگا۔

عربی بولنے والے کہا کرتے ہیں "الناس علی دین ملوکہم" اور ہندی بولنے والے کہا کرتے ہیں "جیسا راجہ ویسی پرجا"۔ الفاظ بدلے ہوئے ہیں مگر بات ایک ہے اور ٹھیک ہے کہ اہلِ اقتدار کا اثر عوام پر پڑتا ہے۔ قرآنِ حکیم سے سبق لینا چاہیں تو قارون کی مثال سامنے آتی ہے کہ لوگوں نے اس کے ٹھاٹ کو دیکھ کر کہا تھا "یالیتَ لَنَا مِثْلَ مَا اُوْتِیَ قَارُوْنُ الآیۃ۔ تاریخ سے سبق چاہیں تو انگریزی دَور کو چھوڑ کر سب سے قریب مغل بادشاہوں کا دَور ہے۔

مغل امراء کے یہاں خادموں کی ایک فوج رہا کرتی تھی۔ کوئی نقیب ہوتا تھا کوئی چوبدار، کوئی مورچھل جھلنے والا کوئی کفش بردار، کوئی عصا بردار۔ باورچی خانہ۔ پوشاک۔ فرش فروش اور سواری وغیرہ کے متعلق الگ الگ محکمے ہوتے تھے۔ ان کے انچارج اور عہدہ دار ہُوا کرتے تھے۔ پھر یہ خدمات خاندانی ہوتی تھیں۔ ان سب محکموں کے افسران اور ملازمین کے متعلقین کی عیال داری نسلاً بعد نسلٍ ان اُمراء کے ذمہ ہوتی تھی۔ یہی طریقہ متوسط درجہ کے لوگوں نے بھی اختیار کر رکھا تھا۔ ہر ایک کے یہاں ضرورت سے زیادہ خدمت گار اور نسل در نسل ان کی عیال داری۔ اس کا دوسرا نام کنبہ پروری رکھ لیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کنبہ پرور ہونا تعریف کی بات بھی مانی جاتی تھی اور یہ فیشن یا ٹھاٹ بھی تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور مصلح عالم۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب بہت برہم ہیں کہ فیشن پرست ٹھاٹ کے متوالے خوش حال لوگ اس رواجی کنبہ داری پر بے شمار دولت خرچ کرتے ہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ جو اللہ نے فرض کی ہے اس کو ادا کر دیں۔ اس طرزِ معاشرت یا اس تہذیب اور فیشن کی بنیادیں اتنی گہری تھیں کہ خاندان ختم ہو گئے، مگر یہ فیشن ختم نہیں ہُوا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد اپنے بچپن (۱۹۱۰ء) تک ان کے مٹتے ہُوئے آثار پُرانے خاندانوں میں ہم نے دیکھے ہیں۔

آجکل ایک سیاسی لیڈر کی مقبولیت کا عام چرچا ہے کہ ان کی پینسٹھویں سالگرہ

پر اُن کی پارٹی نے ۷۰ء کے الیکشن کے لیے ۶۵ لاکھ روپیہ جمع کیا ہے جو ان لیڈر صاحب کو پیش کیا جائے گا۔ کچھ عرصہ ہُوا ایک فرقہ کے پیشوا سر آغا خاں کو ان کے ماننے والوں نے سونے سے وزن کیا تھا۔ مغل بادشاہوں میں وزن کیے جانے کی رسم ہر سال منائی جاتی تھی نہ صرف ایک دفعہ بلکہ سال میں دو دفعہ۔ سالگرہ کی تقریب کے وقت اور جشنِ تاجپوشی کے موقع پر بادشاہ سات چیزوں سے تولے جاتے تھے۔ پہلے سونے سے پھر چاندی سے پھر بادام، طوطیا وغیرہ مختلف چیزوں سے۔ ایک باقاعدہ محکمہ ہوتا تھا جو ان چیزوں کو اپنی تحویل میں لے کر درج رجسٹر عزباء اور ضرورت مندوں پر تقسیم کیا کرتا تھا۔

ایک صاحبِ حیثیت کے لیے سات چیزوں سے تلنا تو آسان کام نہیں تھا، لیکن ہر سالگرہ کے موقع پر بڑھ چڑھ کر تقریب کو منانا اور زیادہ سے زیادہ خیرات کرنا تہذیب کا اہم ترین جُزو بن گیا تھا۔

یہ تہذیب خود مسرفانہ تھی اور جب اس نے عیاشی کی طرف رُخ کیا، تو رقص و سرود بھی اس کا لازمی جُزو بن گیا۔

کسی صاحبِ حیثیت کا سوسائٹی میں کوئی وزن نہیں ہوتا تھا جب تک ایک دو داشتہ نہ رکھتا ہو۔ موجودہ زمانہ کی ایکٹرس سے زیادہ ان کی قدر تھی۔ بڑی بڑی رقمیں ان کی نذر کی جاتی تھیں۔ صرف رقص و سرود میں ان کا آرٹ نہیں ہوتا تھا، بلکہ دلفریب اداؤں کے علاوہ مجلسی آداب میں اس درجہ باسلیقہ ہوتی تھیں کہ مہذب خاندانوں کے بچے ان کے وہاں بھیجے جاتے تھے کہ وہ آداب سیکھیں۔ اس زمانے میں اُونچے معیار کی زندگی کے معنی یہی تھے۔ اب یہ دَور ختم ہو گیا۔ اب اونچے معیار کی زندگی کے نمونے بدل گئے ہیں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ تقاضے نہیں بدلے۔

آج جب اُونچے معیار کی زندگی کا لفظ کانوں میں پڑتا ہے، تو کوٹھیوں اور بنگلوں کی زندگی نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

آراستہ کمرے، قالینوں کے فرش پر شاندار مسہری، سوفا سٹ، مخملی گدوں کی کرسیاں دیواروں پر آرٹ کے بہترین نمونہ کی مورتیاں، تصویریں، فوٹو، میز پر خوبصورت گلدان، تصویر نما پیپر ویٹ، چاندی و سونے کے سگریٹ کیس، سگار کیس، دیواروں پر ریشمی پردے۔ ملاقات کا کمرہ (یا ہال) اس سے بھی زیادہ شاندار اور پرتکلف کھانے کا کمرہ علیحدہ جس میں لانبی میز کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوں، عمدہ پلیٹیں، خوبصورت پرچیں، چاندی کی پالش کے چمچے، کانٹے، ڈونگے، بہترین ڈنر سیٹ وغیرہ۔

طائر فکر کی پرواز لانبی ہوتی ہے، تو وہ یورپ اور امریکہ پہنچ جاتا ہے جہاں عالیشان بلڈنگیں ہیں عظیم الشان ہوٹل ہیں جن کے سامنے ہندوستان کے تمام تکلفات دیہاتیت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ بیسیوں قسم کے کھانے جس میں ہر طرح کا گوشت۔ جام و سبو تو نہیں البتہ ڈنر کے ساتھ بیئر کے ایک دو کپ، محفل شراب کے بجائے کاکٹیل۔ خدمت کے لیے پری وش مسیں حاضر۔ نئے فیشن سے آراستہ جس کے سامنے عریانی بھی شرمانے لگے، رقص کے بجائے ڈانس۔ سرود کے بجائے میوزک، مجلسی غپ شپ کے بجائے فلم، سینما، ڈرامہ وغیرہ وغیرہ۔

آج جب اسٹیج کی بلندی سے اونچے معیار کی زندگی کا شوق دلایا جاتا ہے، تو کیا ہمارے رہنما سننے والوں کے جذبات و احساسات پر مہر لگا دیتے ہیں کہ وہ یورپ اور امریکہ کے عشرت کدوں کا رخ نہ کریں۔ خصوصاً جبکہ آزادی کے بعد ہمارے تعلقات وسیع ہو گئے ہیں اور ہر سال لاکھوں ہندوستانی یورپ اور امریکہ جاتے رہتے ہیں۔

فساد پیدا کرنے والے تقاضے

ہمیں بدحالی سے انسیت اور فاقہ مستی سے محبت نہیں ہے۔ خوش حالی اور دولتمندی کے لیے کوشش کرنا ہمارے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہے، مگر ذرائع جائز ہونے چاہئیں۔ آپ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کام میں لائیے اور ایسی محنت کیجیے جس سے قوم

کو فائدہ پہنچے اور مُلک کی دولت میں اضافہ ہو۔ اس کے صِلہ میں جتنی بھی دولت آپ کو مِلے وہ باعثِ مسرّت ہے۔ ایسی خوش حالی پر بار بار مُبارک باد پیش کی جائے گی لیکن نوعِ انسان اور انسانی سماج کی کمزوری یہ ہے کہ ایک وہ طبقہ ہوتا ہے جو خواب دیکھتا ہے محلوں کی اور محنت اتنی بھی نہیں کرتا کہ پھونس کی جھونپڑی تیار کر سکے، کام سے جان چراتا ہے اور خواہش یہ رکھتا ہے کہ دولت اس کے گھر کی لونڈی ہو۔ وہ جس طرح چاہے دادِ عیش دے۔ اس کی آمدنی کے جائز ذرائع اس کی خواہشوں کو پُورا نہیں کر سکتے، تو وہ ناجائز ذرائع سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ مارتا ہے۔ شریف اور محنت کش شہریوں کے گھروں میں نقب لگا کر اُن کی گاڑھی کمائی کا اثاثہ اُڑا لیتا ہے جسارت کرتا ہے تو ہم جنسوں کی ٹولی بنا کر ڈاکے ڈالتا ہے۔

اگرچہ قانون کی دھمکی اس کے کانوں میں پڑتی رہتی ہے، مگر اس کا تصوّر یہ ہوتا ہے "ساقیا امروز مے نوشیم فردا کس بدید"۔ اس طرح تن آسان عیش پسندوں کا گروہ وہ ہوتا ہے جو یہ ذلیل حرکتیں تو نہیں کرتا، لیکن محنت کے بغیر افراطِ زر کی حرص اس کو بھی ہوتی ہے۔ وہ نفع اندوزی کے سائنٹفک طریقے اختیار کرتا ہے۔ چور بازاری، خیانت، غبن، رشوت، ملاوٹ اور اس طرح کی حرکتیں اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔

جوئے کو ہم بُرا سمجھتے ہیں، مگر بدقسمتی سے اس کی بہت سی قسمیں ہمارے تمدن کا جُزو بن گئی ہیں۔ یہاں تک کہ حکومت بھی ان سے کام نکالتی ہے۔ لاٹری کی تمام قسمیں جوئے ہی کی دلفریب اور خوشنما صورتیں ہیں۔ معمّہ کا رواج بھی اسی کا ایک جُزو ہے۔

درست ہے۔ محنت یہ بھی کرتے ہیں، مگر ان کی محنت نہ مُلک کی دولت میں اضافہ کرتی ہے نہ قوم کی بہترین صلاحیتوں کو آگے بڑھاتی ہے، بلکہ ان کو مفلوج کر دیتی ہے۔ یہ بھی رات دن دوڑ دھوپ کرتے ہیں، مگر اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے

کر وہ دولت کی صحیح گردش کا رُخ بگاڑ دیتے ہیں اور ان دماغوں کو بحرانی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں جو اگر محفوظ رہتے، تو قوم اور ملک کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔

عمریں گزر گئیں اور انقلاباتِ عالم کی تاریخ نے سینکڑوں ورق پلٹ دیے، مگر فطرت کے اس گٹھ جوڑ میں فرق نہیں آیا کہ جس سوسائٹی میں جوئے اور سٹے جیسی علتوں کا رواج ہوتا ہے شراب بھی اس کے لیے رُوحِ رواں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلامیات پر نظر رکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں ان سب کا تذکرہ ساتھ ساتھ کیا گیا۔ (سورۂ بقرہ ، سورۂ مائدہ وغیرہ)

نتیجہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ جیب تراشی، چوری، ڈکیتی یا رشوت، غبن اور جوئے سٹے جیسے سماجی امراض پسماندہ سوسائٹی میں نہیں ہوتے جس طرح انسانوں کا کوئی گروہ جسمانی امراض سے خالی نہیں ہوتا وہ ان رُوحانی اور اخلاقی بیماریوں سے بھی خالی نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی بھی حکومت خواہ وہ پرلے درجہ کی تنگ نظر شخصی حکومت ہو، یا اعلیٰ درجہ کی جمہوری حکومت، حفظانِ صحت کا محکمہ قائم کر کے بیماریوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے، مگر کوئی ایسا عمل قطعاً گوارا نہیں کرتی جس سے امراض میں اضافہ ہو اور کوئی معمولی بیماری وبائی صورت اختیار کرے، لیکن اس کے برعکس جب اُونچے معیار کی زندگی کو نصب العین بنا کر اس کی ترغیب دی جاتی ہے تو جس طرح نئے خون سے پیدا ہونے والے تازہ جذبات کا رُخ یورپ اور امریکہ کی تہذیب و تمدن اور وہاں کی عیش پرستانہ معاشرت کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے قومی رہنما اور حکومت کے ذمہ دار جب اُونچے معیار کی زندگی کو نصب العین قرار دے کر اس کی ترغیب دیتے ہیں تو وہ قدرتی طور پر ان اخلاقی اور روحانی بیماریوں کے جراثیم میں جان ڈال دیتے ہیں، کیونکہ اس ترغیب کے نتیجہ میں اگر ایک طرف نئے خون سے پیدا ہونے والے تازہ جذبات

یورپ اور امریکہ کے تمدن اور عیش پرستانہ معاشرت کو منزلِ مقصود بناتے ہیں تو دوسری جانب نفع اندوزی کے حریص، کام چور، عیش پرست طبقہ کو شہ ملتی ہے کہ وہ اپنے ہنر سے کام لے اور اونچی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرے۔

جب ترقی کی منزل اونچے معیار کی زندگی ہے اور سوسائٹی اس طرف قدم بڑھا رہی ہے تو جو لوگ چور بازاری، رشوت، خیانت، جوئے اور سٹے جیسے امراض کے مریض ہیں۔ ان کے امراض کی روک تھام بھی نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے جراثیم میں جان پڑ جاتی ہے۔

کسی ساتھی کا پرچہ دیکھ کر جواب لکھ دینا ضابطۂ امتحان کے لحاظ سے بلاشبہ جرم ہے، مگر طالب علم اس اخلاقی فلسفہ کی طرف توجہ نہیں کرتا وہ ناکامی سے بچنے کیلئے اس اخلاقی جرم کو قابلِ برداشت سمجھتا ہے اور لطف یہ ہے کہ جو طلباء بتا سکتے ہیں وہ بھی اسے کارِ خیر سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہو سکے اشارہ کنایہ کر کے مبتلاءِ امتحان مصیبت زدہ ساتھی کی امداد کریں۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ رشوت لینے والوں اور اسمگلنگ کرنے والوں سے عموماً نفرت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ہمدردی ہوتی ہے، کیونکہ زندگی کا معیار جو ہم نے اختیار کر لیا ہے باوجودیکہ وہ اونچا نہیں ہے مگر اس کو نبھانے کے لیے فاضل آمدنی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اور لینے والے کو معذور سمجھا جاتا ہے پس جب اونچے معیار کی زندگی کا راگ الاپتے ہیں تو گویا ہم اشارہ کرتے ہیں۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ اور یہ مجرم بھی اس نصب العین کے اپنانے کے لیے اپنے جرائم کو عذر قرار دیتے ہیں۔

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

قول اور فعل میں مخالفت

یہ تو بہت مشکل ہے کہ آپ یورپ یا امریکہ پہنچ کر وہاں کسی ہوٹل یا کلب کا معاینہ فرمائیں، البتہ دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں پہنچ سکتے ہیں۔ ان شہروں میں بڑے بڑے ہوٹل ہیں جو یورپ یا امریکہ کے معیار کے تو نہیں ہیں البتہ

نمونہ وہی ہے جو اُونچے درجہ کے انسان ان ہوٹلوں میں دادِ عیش دیتے ہیں ان کو غور سے دیکھیے ان کے طرز و انداز پر نظر ڈالیے۔

خوفِ خدا - خدا پرستی - اخلاص وللّٰہیت تو ایسے الفاظ ہیں کہ ان بڑے لوگوں کے سامنے ان کا زبان پر لانا بھی جُرم ہے - خود اُن کے الفاظ کو یاد کیجیے - غریبوں کی امداد، بھوکوں سے ہمدردی، خلقِ خدا کی خدمت وغیرہ وغیرہ۔

آپ گہری نظر ڈالیے - کیا ان کے دِلوں کے کسی گوشہ میں ان الفاظ کی حقیقت کا کوئی شمہ یا کوئی ریشہ بھی پایا جاتا ہے یا یہ الفاظ صرف رہنمائی اور قیادت کا فیشن ہیں۔ اور دِلوں کے تہہ خانے، خود غرضی، خود پسندی، نفع اندوزی، نمود و نمائش، باہمی رقابت اور ہوسِ اقتدار کے انبار سے پٹے ہُوئے ہیں جن غریبوں کا بار بار نام لیتے ہیں ان سے محبّت کے بجائے نفرت ہے ان کی عظمت شان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ غریب ان کے پاس بیٹھ سکیں۔

ایسی زندگی جو تصورِ خدا سے نا آشنا، دِل کی نرمی سے محروم، شان وشوکت کی دلدادہ، اقتدار کی حریص، خود پرست وخود نما ہو - اپنے سوا کسی کو نظر میں نہ لاتی ہو قرآنِ حکیم میں اس کیلیے "بطر" کا لفظ استعمال کیا گیا - یعنی اپنے آپے سے باہر اترائی ہُوئی زندگی۔

آپ ان ہوٹلوں کی سیر کریں تو آپ کو وہی نظر آئیں گے جو "بطر" کی تصویر ہیں - جن کے فعل اور قول میں اتنا ہی اختلاف ہے جتنا تاریکی اور روشنی میں - رات اور دن میں - پتھّر اور پانی میں - آگ کے انگاروں اور برف کے تودوں میں۔

اسلام اس قسم ظریفی کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک طرف افزائشِ دولت، افراطِ زر اور نفع اندوزی کے خلاف شور اور ہنگامے برپا کر کے آسمان سر پہ اُٹھایا جائے اور دوسری طرف اُونچے معیار کی زندگی کی ترغیب دے کر افراطِ زر کو نصب العین اور بُنیادی ضرورت بنا دیا جائے - بلند معیارِ زندگی کا شوق پیدا ہو اور افراطِ زر کی حرص فتنہ برپا نہ

کرے۔ ناممکن ہے۔

ساز کو چھیڑ کے کہتے ہو کہ آواز نہ ہو

یہ اُونچے معیار کی زندگی جس کی مثال یورپ اور امریکہ کے عشرت کدے پیش کر رہے ہیں جس کو بدقسمتی سے ہم نے کامیابی اور ترقی کا نشان تصوّر کرلیا ہے۔ اسلام کہتا ہے یہ تنزل کی شاہراہ اور تباہی کا پیش خیمہ ہُوا کرتی ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ "دینِ فطرت" فطرتِ انسان کا نبض شناس ہو اور وہ صرف شاخوں اور بھونگلوں کو تراش کر مطمئن نہ ہوں بلکہ وہ قطع و برید اور استیصال کا نشانہ جڑ کو بنائے، نفع اندوزی۔ غبن۔ رشوت۔ چور بازاری۔ سُود۔ جُوا۔ سٹہ۔ لاٹری۔ چوری۔ ڈکیتی یہ سب ہراول دستے اور شاخیں ہیں۔ اسلام جب ان کو حرام قرار دیتا ہے تو اس سرچشمہ کو بھی بند کر دیتا ہے جہاں سے ان کی نالیاں رِستی ہیں اور سوتیں اُبلتی ہیں۔

مسرفانہ اور مترفانہ زندگی جو اپنے آپے سے باہر خود فراموش اور خدا فراموش، اترائی ہُوئی اور برخود غلط ہو، اسلام سب سے پہلے اس کو حرام اور خبیث قرار دیتا ہے اور وہ تمام چیزیں جو اس کے لوازمات ہیں ان کو ممنوع گردانتا ہے وہ صرف شراب اور رقص و سرود ہی کو حرام نہیں کہتا۔ جن کو بدقسمتی سے کچھ برگشتہ مزاج بد ذوق، فنونِ لطیفہ اور آرٹ قرار دیتے ہیں بلکہ وہ سونے چاندی کے برتنوں اور مَردوں کے لیے زربفت و زردوز لباس اور ریشمی کپڑے کو بھی حرام قرار دیتا ہے کیونکہ وہ مترفانہ زندگی کے لوازمات ہیں۔

جب نخل آرزو کی یہ جڑیں ہی کٹ گئیں تو قدرتی طور پر وہ طوفان پایاب ہو جائے گا جو رشوت، خیانت، چور بازاری اور ملاوٹ وغیرہ کا ہیجان برپا کیا کرتا ہے۔

یعنی جب اس طرح کی زندگی ممنوع قرار دی گئی اس کو تباہی کا پیش خیمہ بتا دیا گیا اور آگاہ کر دیا گیا کہ خدا پر یقین رکھنے والا کوئی بھی شخص ایسی زندگی نہیں اختیار کر سکتا اور جب کہ اس طرح کی زندگی کے شوق کو مجرمانہ شوق قرار دے دیا گیا تو لامحالہ نفع اندوزی اور افراطِ زر کی دَوڑ بھی ختم ہو جائے گی۔

کتاب اللہ نے اس مضمون کو متعدد پیرایوں میں ادا فرمایا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:
وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۔ (سورہ قصص ع ۶ ۲۸/۵۸)
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجد آفریں ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

اور کتنی کھپا دیں ہم نے بستیاں جو اترا چکی تھیں اپنی گذران میں، اب یہ ہیں ان کے گھر (مثلاً دہلی کا لال قلعہ) بسے نہیں ان کے پیچھے مگر تھوڑے دنوں اور ہم ہیں آخر سب سے بسنے والے۔

پُوری قوم کیسے اُونچی اُٹھتی ہے

آپ کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے ہوں اور گھٹیلوں چلنے والے بچّہ کو نصیحت کریں کہ وہ آپ کی تیز گامی کا ساتھ دے یہ بچے کے حق میں شفقت و محبت نہیں ہے بلکہ سراسر ظلم ہے۔

پیدل چلنے والے کو آپ ساتھ چلانا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر کار سے اُتر جائیے۔ شور لیٹ کار آپ کو لے کر روانہ ہو جائے اور آپ ان ناپیادہ غریبوں کو ہدایت فرمائیں کہ ساتھ چلو۔ یہ آپ کی ہمدردی نہیں بلکہ سنگ دلی ہے۔

بس اُونچے معیار کی زندگی کے بجائے اس معیارِ زندگی کی تلقین کیجیے۔ جس کو پُوری قوم نہ سہی افراد قوم کی اکثریت اپنا سکے۔

مساوات کا لفظ زبانوں پر بار بار آتا ہے بلکہ ہماری جمہوریت کا موٹو اور موٹو گرام ہی مساوات اور برابری ہے، لیکن ان الفاظ کو اگر شرمندۂ معنی کرنا ہے، تو مہربانی فرما کر نیچے اُتر لیے، اُونچے معیار کے بجائے مساویانہ معیارِ زندگی کو نصب العین بنائے اور اسی کا پرچار کیجیے۔

اسلام نے جب نظریۂ مساوات کی تعلیم دی تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

جیسے دولتمندوں نے فقیرانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ (رضی اللہ عنہم)

انہوں نے گھٹلیوں چلنے والے بچوں کو یہ فرمائش نہیں کی کہ ان کی تیز گامی کا ساتھ دیں، بلکہ اپنی رفتار دھیمی کر کے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ جو ابھی چل بھی نہیں سکتے تھے۔

دیکھو خباب بن الارت۔ صہیب رومی۔ بلال حبشی۔ عمار بن یاسر۔ زید بن حارثہ جیسے کتنے ہی غلام آزاد ہیں اور آزاد کرنے والوں کے برابر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی دوست بنا ہوا ہے۔ کوئی بھائی۔ کوئی بیٹا۔ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد یہ ہے:

لیس بالمومن الذی یشبع وجارہ جائع۔

ترجمہ: وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر لے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ (ترمذی شریف)

وحی الٰہی غیرت دلا رہی ہے: وما ادرٰك ما العقبۃ فك رقبۃ۔ الآیۃ (سورہ بلد، پارہ ۳۰)

تم فخر کرتے ہو کہ فلاں پہاڑ کی چوٹی سر کر لی۔ فلاں گھاٹی کو قبضہ میں لے لیا۔ فلاں پر جھنڈا لہرا دیا۔ تم اس کو کامیابی سمجھتے ہو۔ پتھروں اور چٹانوں کے پہاڑ کی گھاٹی طے کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ گردنیں چھڑانے کی گھاٹی طے کرو۔ غلاموں کو آزاد کرو، قحط اور فاقہ کے زمانے میں قرابت مند یتیموں کو اور لاچار اور خاک میں رلنے والے ضرورت مندوں کو کھانا کھلاؤ۔ ان کی ضرورتیں پوری کرو۔ (یہ ہے گھاٹی جس کو طے کرنے پر فخر کیا جا سکتا ہے)۔

پوری قوم کس طرح ترقی کر سکتی ہے

سرورِ کائنات جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ طیبہ تشریف لائے ہیں تو سب سے پہلے دعوتِ اسلام کا خلاصہ ان چند جملوں میں پیش فرماتے ہیں اور اس پر عمل کراتے ہیں۔

اِفْشُوا السَّلَامَ

سلام کا رواج زیادہ کرو (اس سے انسیت پیدا ہوتی ہے۔ میل جول بڑھتا ہے) معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ سلامتی پھیلاؤ، امن عالم کے علمبردار بنو۔

وَاطْعِمُوا الطَّعَامَ

بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔

وَصِلُوا الْاَرْحَامَ

رشتہ داروں کی خدمت کرو۔ ان سے اچھا سلوک کرو۔

وَصَلُّوا وَالنَّاسُ نِیَامٌ

جب لوگ سو رہے ہوں (خاص طور پر) اُس وقت نماز پڑھو۔

تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ

جنت میں چین سے داخل ہو جاؤ گے۔ (ترمذی شریف ص۲؎ ج ۲)

ستم رسیدہ مُسلمان مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچتے ہیں۔ وہاں خوشحال

تھے۔ یہاں تہی دست اور تباہ حال۔ اس وقت مدینہ کے مُسلمان زمیندار کاشت کار (انصاری صاحبان) اپنے بالاخانوں یا اٹاریوں کی بلندی سے ان کو مساوی زندگی کی ہدایت نہیں فرماتے بلکہ نیچے اُترتے ہیں۔ مہاجرین کے برابر بیٹھتے ہیں ان کو مرنے جینے میں شریک کرتے ہیں پھر جس کے پاس جو کچھ جائداد ہے آدھی مہاجر بھائی کو دے دیتے ہیں۔

مہاجرین کرام جنہوں نے زندگی مکّہ میں گزاری تھی عموماً تاجر پیشہ تھے۔ کاشت سے ناواقف تو حضرات انصار جس طرح جائداد میں ان کو برابر کا شریک بناتے ہیں۔ یہ ذمہ داری بھی لیتے ہیں کہ تمام کام وہ کریں گے اور پیداوار مہاجر بھائی کو پیش کر دیں گے۔

(بخاری شریف)

یعنی محض تقسیم اور تنصیب ہی نہیں بلکہ کاشت کاروں کے لیے رضاکارانہ خدمات بھی پیش کر دیتے ہیں — یہاں نہ کسی اسمبلی یا پارلیمنٹ کا قانون ہے نہ صدرِ جمہوریہ کا آرڈیننس۔ یہاں ایمان ہے، خوفِ خدا ہے اور خدا پرستی ہے، سچائی اور سچائی کی حمایت ہے۔ سچّی ہمدردی اور امدادِ باہمی کا حقیقی جذبہ ہے، وسعتِ ظرف۔ بلند ہمّتی، فراخی حوصلہ اور جذبۂ ایثار ہے اور ان سب کی بنیادوں کی تبدیلی ہے۔

قرآنِ حکیم نے تمثیل (استعادہ) کے انداز میں حضرات انصار کی شان یہ بیان کی ہے۔ "ایمان" کو ایک قلعہ یا شہر تصوّر کیا جائے۔

تو یہ (انصار) وہ ہیں جنہوں نے ایمان کے اس قلعہ کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ جس طرح مدینہ ان کا وطن ہے۔ اسی طرح ایمان کے حصن حصین اور مضبُوط قلعہ کو بھی انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ یہیں رہ پڑے۔ اسی قلعہ میں جم گئے۔ (وہ بہادر مہاجرین) جنہوں نے ایمان و صداقت کی خاطر بے پناہ مصیبتیں اُٹھائیں، بالآخر ہجرت، اور ترکِ وطن پر مجبُور ہوئے۔ ان (انصار) کو ان خدا پرست، صداقت پسندوں سے محبّت ہے۔ ایسی بامعنی محبّت کر ان کے فائدہ کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے نفع کے خواہاں رہتے

ہیں؛ چنانچہ مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں محسوس کرتے۔ خود اپنی ضرورتوں کو خواہ وہ کتنی ہی پریشان کُن ہوں پیچھے ڈالتے ہیں اور ان مہاجرین کی ضرورتوں کو مقدم رکھتے ہیں۔ (سورہ حشر $\frac{59}{9}$)

چند واقعے بیان کیے جاتے ہیں ان سے سبق لیجیے؛

(۱) سیّدالانبیاء (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مدینہ طیبہ میں ایک راستہ کے کنارے پہ ایک مکان دیکھتے ہیں اس کا پھاٹک شاندار ہے۔ حال ہی میں تعمیر ہُوا ہے۔ اس پر قبہ کی طرح محراب بھی ہے۔ دریافت فرمایا: یہ پھاٹک کس کا ہے؟ مدینہ کے ایک قدیم باشندہ انصاری کا یہ مکان تھا۔ ان کا نام لے دیا گیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم خاموش ہو گئے۔ اگلے روز یہ انصاری خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ آقائے دوجہاں (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا کچھ رُخ بدلا ہُوا ہے وہ التفات نہیں ہے جو ہُوا کرتا تھا۔ ایک جاں نثار کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہو سکتی تھی اب اپنے آپ کو ٹٹولتے ہیں۔ اپنے دِل سے سوال کرتے ہیں۔ ساتھیوں سے پُوچھتے ہیں۔ مجھ سے کیا قصور ہُوا کہ میرے آقا ناراض ہیں؟ ساتھی بھی کوئی سبب نہیں بتا سکتے۔ سوچ بچار کر کے اتنا بتاتے ہیں کہ کل جب سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم تمہارے مکان کی طرف سے گزرے تھے تو پھاٹک کو دریافت کیا تھا کہ کس کا ہے۔ لوگوں نے آپ کا نام بتا دیا تھا انصاری بزرگ نے اتنی بات سُنی، فوراً واپس تشریف لے گئے اور پھاٹک منہدم کرا دیا۔

(ابوداؤد شریف (باب البناء)

آپ نے خیال فرمایا اشارہ ہی اشارہ میں کس مساوات کی تعلیم ہو گئی اور کس مستعدی اور ایثار سے اس پر عمل ہُوا۔ کاش مُسلم ممالک کے حکمران ان اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اخلاص کی انتہا

اخلاص کا سبق ان بزرگوں سے سیکھیے کہ اتنا بڑا نقصان کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو خبر بھی نہیں کی۔

کچھ دِنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پھر اس طرف تشریف لے گئے دیکھا وہ گنبد نما پھاٹک نہیں ہے۔ فرمایا وہ پھاٹک کیا ہُوا۔ صحابہ نے عرض کیا جب مالک کو آپ کی ناراضی کا علم ہُوا تو انہوں نے خود منہدم کرا دیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس موقع پر تو یہی فرمایا: اما ان کل بناء وبال علی صاحبه الا مالا الا مالا الا مالا یعنی مالا بد منه (ابوداؤد شریف باب فی البناء)

یعنی ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے، مگر وہ تعمیر جو بہت ضروری ہو جو بہت ضروری ہو جس کے بغیر چارہ ہی نہ ہو۔

لیکن دوسرے موقع پر آپ نے یہاں تک فرمادیا:

النفقه کلها فی سبیل الله الا البناء فلا خیر فیه (ترمذی شریف صفحہ ۲۰۱ ج۲)

جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے، مگر تعمیر۔ کہ اس میں کوئی بھلائی اور خیر نہیں ہے۔

"مسکن" انسان کی بُنیادی ضرورت ہے۔ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "عمال" (کارپردازانِ حکومت) کے لیے تین چیزیں تسلیم فرمائی ہیں۔

"اہلیہ۔ خادم۔ مسکن" (ابوداؤد شریف باب رزق العمال وکتاب الاموال لابی عبید وغیرہ یعنی بیوی اور بچوں کے ضروری خرچ کے ساتھ ایک خادم اور مکان بھی اس کا حق ہے) تو پھر سلسلۂ تعمیر کو خیر سے محروم کرنے کے کیا معنی؟ لیکن حیات مقدسہ کے دور کے اقتصادی حالات اور پھر تعمیرات مدینہ طیبہ کی تدریجی ترقی کو سامنے رکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ جس سطح سے اقتصادی ترقی شروع کی گئی تھی بظاہر یہ ارشاد اس لیے

تھا کہ اس میں مساوات قائم رہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا منصوبہ (پلان) یہ تھا کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں کسی مسلمان کے یہاں جب بھی پیدائش ہو تو پیدائش کے اندراج کے ساتھ ساتھ "بیت المال" سے بچّہ کا وظیفہ بھی جاری ہو جائے۔ شہروں کی حدود تک یہ نافذ اور جاری ہو چکا تھا اگر آپ کو کچھ اور موقع مل جاتا تو صحرا اور دیہات کے باشندے بھی اس سے بہرہ اندوز ہونے لگتے۔ آپ نے فرمایا تھا:

واللہ لئن بقیت لیاتین الراعی بجبل صنعاء حظّہ من ھذا المال وھو مکانہ قبل ان یحمر وجھہ یعنی فی طلبہ۔

اگر میں زندہ رہ گیا تو یہ طے شدہ پختہ بات ہے کہ ایسا ہوگا کہ جو چرواہا (مدینہ سے بہت دُور) صنعاء یمن کے پہاڑ میں بکریاں چراتا ہوگا بیت المال سے جو کچھ اس کا حصّہ (وظیفہ) مقرر ہوگا، وہ اس کے پاس وہیں پہنچ جایا کرے گا۔ اس کی نوبت نہیں آیا کرے گی کہ اس کو وظیفہ وصول کرنے کے لیے (سفر کرنے اور) اپنے چہرہ کو سُرخ کرنے (دُھوپ میں تپانے کی) ضرورت ہو۔

وظیفہ کی تفصیل بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ جذبۂ مساوات یہاں بھی کارفرما ہے۔

کان دیوان حمیر علیٰ حدۃ وکان یفرض لامراء الجیوش والقری فی العطاء مابین تسعۃ الآف وثمانیہ الآف وسبعۃ الآف علیٰ قدر مایصلحھم من الطعام ومایقومون بہ من الامور قال وکان للمنفوس اذا طرحتہ امّہٗ مائۃ درھم فاذا ترعرع بلغ بہ مائتین فاذا بلغ زادہٗ ولمارای المال

کثر قال لئن عشت الیٰ ھٰذہ اللیۃ من قابل لالحقن اخری الناس باو لاھم حتی یکونوا فی العطاء سواء قال فتوفی رحمہ اللہ قبل ذالک۔

(کتاب الخراج لابی یوسف رح ص ۴۶)

ترجمہ: حمیر (یمن کا مشہور قبیلہ جو کئی سو برسوں تک یمن کے بڑے حصہ پر حکمران رہا تھا) اس قبیلہ کے لیے دیوان (دفتر) علیحدٰہ تھا۔ فوجی اور سول افسران کے وظائف ان کی خوراک اور جو فرائض ان سے متعلق تھے ان کی ضرورتوں کے پیشِ نظر یعنی (ذاتی اور منصبی ضرورتوں کے لحاظ سے) دس ہزار، آٹھ ہزار اور سات ہزار درہم (سالانہ) (ایک درہم تقریباً تیس نئے پیسے کا) تھے اور جو بچہ جیسے ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا تھا۔ سو درہم (سالانہ) اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا۔ (تقریباً دو روپیہ ماہوار۔ جو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ممکن ہے پچاس روپے ماہوار کی برابر ہوں کیوں کہ اس زمانہ میں بکری کی قیمت دس[1] درہم ہوتی تھی جو آج کل (ڈھائی سو درہم تقریباً اسی روپیہ ہے یعنی تقریباً پچیس گنی زائد) جب وہ بچہ ہوشیار (تعلیم پانے کے قابل) ہو جاتا تو وظیفہ سالانہ دو سو درہم اور جب بالغ ہوتا تھا تو اور اضافہ کر دیا جاتا تھا، لیکن جب بیت المال کا سرمایہ بڑھ گیا تو سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ اگر میں اگلے سال اس رات (تاریخ)

---

[1] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اونٹوں کی زکوٰۃ کے متعلق جو فرمان جاری فرمایا اس میں ایک خاص صورت کے متعلق یہ ہے کہ دو بکریاں دے دیں یا بیس درہم۔ (بخاری شریف ص ۱۹۵۔

تک زندہ رہ گیا تو جو سب سے مؤخر ہیں ان کو مقدم سے ملا دوں گا۔
تاکہ اس وظیفہ میں سب برابر ہو جائیں، مگر قضا و قدر کا فیصلہ یہ تھا کہ
فاروقِ اعظمؓ اسی سال شہید کر دیے گئے۔

بھوکوں کے لیے روٹی اور ملک سے غریبی دور کرنا اگر حکومت کا بنیادی نصب العین ہے تو جب تک نصب العین کامیاب نہ ہو آنحضرت صلی اللہ کے ارشاداتِ سابق کے بموجب حکومت کا نظریہ وہی ہو گا جو خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دستور العمل رہا تفصیل یہ ہے کہ آپ کے دورِ خلافت میں تو ہو گیا کہ بعض علاقوں میں افلاس کا نام و نشان نہیں رہا، لیکن وہ مسجدِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) جو اس وقت اس فاروقِ اعظم کا دربار بن گئی تھی۔ جس کی حدودِ مملکت مشرقِ وسطیٰ کی سرحدوں سے بھی گزر چکی تھی اور جس کی شوکت و حشمت سے پوری دنیا کے بڑے بڑے حکمران لرزاں براندام تھے وہ مسجد اسی طرح کچی رہی اوپر چھپر تھا اور نیچے کنکریوں (بجری) کا فرش۔ آپ نے مسجد میں توسیع کی۔ تب بھی نظریہ یہ تھا "اکنّ النّاس من المطر" میں بارش سے لوگوں کو بچانا چاہتا ہوں۔ (بخاری شریف صـ ۶۴)

اب غریبی کے خاتمہ کی مثال ملاحظہ فرمائیے۔ والیٔ یمن (گورنر) حضرت معاذ بن جبلؓ نے اہلِ یمن سے جو زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکزی بیت المال میں بھیجا۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے رپورٹ پیش ہوئی تو آپ نے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کو لکھا۔

آپ کو یمن میں اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہاں سے چندہ جمع کریں یا جزیہ وصول کریں اور یہاں بھیجیں آپ کو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہلِ استطاعت سے زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی؟

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا: سب کو دے دیا گیا۔ جب یہاں کوئی لینے والا نہیں رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی۔

اگلے سال حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم بیت المال میں بھیج دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی ہی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا:

ما وجدت احداً یاخذ منی شیئاً۔ "کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے"۔

(کتاب الاموال لابی عبید حدیث ص ۵۹۶ / ۱۹۱۱)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت شروع ہوا تو مدینہ کی حالت بھی یہ ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لیے پھرتے تھے اور کوئی ایسا شخص نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کرلے۔

۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت کی یہ حیثیت ہوئی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ۲۴ھ سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی صرف ۱۷ سال کے عرصے میں پوری مملکت کی یہ حالت ہوئی کہ افلاس کا نام و نشان نہ رہا۔

اب تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسجدِ نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی تعمیر اگرچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی ذاتی رقم سے کی اور بیت المال سے یا مسلمانوں سے کوئی مدد نہیں لی، لیکن جب تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا تو تھوڑے ہی عرصے میں مدینہ طیبہ کی آبادی سلع تک پہنچ گئی جو اُحد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ سیدنا حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو اگرچہ تعمیر کا یہ سلسلہ اب بھی ناگوار تھا۔ مگر عام صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے معنی بظاہر وہی سمجھے جو اُوپر تحریر کیے گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافتِ راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول و خرچ کے بارے میں وہ احتیاط نہیں رہی، مگر جو "اقتصادی ساکھ" قائم ہو چکی تھی اس میں فرق نہیں آیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون سال بعد خاندان بنی امیہ کے عادل ترین خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفی رجب ۱۰۱ھ ۷۲۰ء) نے نظام مملکت اپنے ہاتھ میں لیا تو حکومت کی سیرچشمی اور عوام کی خوشحالی کے اندازہ کے لیے ذیل کا دلچسپ واقعہ کافی ہے۔

"عبدالحمید بن عبدالرحمٰن، عراق کے گورنر تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے ان کے نام حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے تعمیلِ حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کیے جا چکے ہیں پھر بھی کافی رقم باقی رہ گئی ہے۔ دربارِ خلافت سے حکم صادر ہوا: "آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں ان کا جائزہ لیجیے اور ان سب کے قرض ادا کیجیے جو بے ڈھنگی اور فضول خرچی کی بنا پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔"

گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروضوں کے قرض ادا کیے جا چکے ہیں پھر بھی کافی رقم بچ گئی۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمان صادر کیا: جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرائیے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی رپورٹ یہی دی کہ رقم کافی بچ گئی ہے تو حکم ہوا کہ جو غیر مسلم کاشت کار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجیے ان کو تقاوی کی ضرورت ہو تو ان کو اتنی تقاوی دیجیے کہ وہ آسانی اور سہولت سے اپنی زمینیں بو سکیں۔

(کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۲۱ ص ۲۵۱)

ایک دلچسپ واقعہ پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سے کارپردازان حکومت کے طریقہ کار کا اندازہ ہو گا۔

وہی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ان کو ساعی (کلکٹر) کی حیثیت سے قبیلہ بنو کلاب بھیجا گیا۔ وہاں لوگ ضرورت مند زیادہ تھے۔ جو کچھ وصول ہُوا وہ سب ان پر خرچ ہو گیا۔ حضرت معاذ کے پاس صرف ٹاٹ کا ٹکڑا رہ گیا جو بچھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے تھے، اُسی کو مونڈھے پر ڈالے ہُوئے واپس آ گئے۔ مکان پر پہنچے تو بیگم صاحبہ نے فرمایا کلکٹر صاحبان جو وصول کیا کرتے ہیں اس میں ان کا کچھ حصّہ ہُوا کرتا ہے آپ میرے لیے تو کیا لاتے، بچّوں کے لیے بھی کچھ نہیں لائے۔ آپ کا حصّہ کیا ہُوا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ایک مرتبہ ایک "ضاغط" میرے ساتھ رہا۔ اس نے کچھ نہیں لینے دیا (ضاغط نگران کو کہتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو حقیقی نگران ہے وہ دیکھ رہا تھا کہ ایسی حالت میں جو بنی کلاب کی تھی، میرے لیے اپنا معینہ حصّہ لینا بھی مناسب نہیں تھا، لہٰذا مَیں نے وہ بھی تقسیم کر دیا۔ بیگم صاحبہ "ضاغط" کی یہ اصطلاع نہیں سمجھ سکیں۔" انہوں نے فرمایا: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دیانتداری پر اعتماد کرتے رہے۔ اُن کی نظر میں آپ "امین" تھے۔ پھر ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے ہمیشہ آپ کو "امین" سمجھا اور آپ کی دیانت داری پر اعتماد کیا یہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کو کیا ہو گیا کہ وہ آپ کے ساتھ ضاغط "نگران" بھیجنے لگے؟

بیگم صاحبہ کو بہت غصّہ آیا۔ انہوں نے اور عورتوں سے اس کی شکایت کی اور شدہ شدہ یہ شکایت حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بُلا کر فرمایا مَیں نے آپ کے ساتھ نگراں کب بھیجا؟

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پُورا واقعہ بیان کیا اور معذرت کی کہ اہلیہ کے مطالبہ کے جواب میں مَیں نے یہ مبہم لفظ بول دیا تھا۔ کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہنسی آ گئی۔ پھر آپ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ

کو بیت المال سے کچھ عنایت فرمایا کہ بیوی کو دے کر خوش کر دیں۔

(کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱۲ ص ۵۵۶

(۲) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔

اس قبیلے کے جو خاندان اسلام سے مشرف ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار رہتا تھا، لیکن ان کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں توشہ ختم ہونے لگتا تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو کچھ غلہ یا توشہ ہوتا تھا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے۔ پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی تعاون کی سبق آموز صورت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے ان کا یہ دستور بیان فرماتے تھے۔

پھر فرماتے: ھم منی و انا منھم (بخاری شریف صفحہ ۳۳۸)

ترجمہ: وہ مجھ سے ہیں۔ میں ان سے ہوں۔ یعنی وہ میرے ہیں اور میں ان کا۔

منشاء مبارک یہ ہے کہ جذبہ کی ہم آہنگی نے مجھے اور ان کو ایک کر دیا ہے۔ ان کا عمل میری منشاء کے عین مطابق ہوتا ہے) اور میرا جو منشاء ہے وہ اس کو پورا کرتے ہیں۔

یہ ہے مساویانہ زندگی کی تعلیم اور وہ ملی اور قومی پروگرام جو انقلابات کی تاریخ کے لیے بہترین سبق ہو سکتا ہے۔ اور جہاں سے قوم کی اعلیٰ ترقی کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انصاری بزرگ کا پھاٹک ناپسند ہے کیونکہ وہ سطح مساوی سے کچھ ابھرا ہوا تھا، اور اشعری حضرات کا یہ دستور یہاں تک پسند ہے کہ

سرورِ کائنات خود کو انہیں میں شمار کر رہے ہیں، کیونکہ سطح میں جو کچھ عارضی اُونچ نیچ ہوتی تھی ہمدردی کے وقت وہ بالکل مساوی ہو جاتی تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ اشتراکیت کا اگر کوئی مفید مقصد ہے تو انفرادی ملکیت کے باوجود وہ مفید مقصد نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے پُورا ہو جاتا تھا۔

چند روایتیں اُور ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ جب آپ سفر میں تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رض سے رخصت ہوتے تھے اور جب سفر سے تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہ کے یہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہُوئے اور حسبِ معمول سب سے پہلے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے یہاں پہنچے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں تشریف لے گئے دروازہ سے ہی واپس ہو گئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ یہ نئی بات کی تھی کہ حجرہ (کمرہ) کے دروازہ پر کپڑے کا پردہ آراستہ کر رکھا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہُوئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا غمگین بیٹھی تھیں۔ جب انہیں سبب معلوم ہُوا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔

ارشاد ہُوا وہاں دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے۔ یہ دُنیاوی تکلّف ہے مجھے اس سے کیا واسطہ۔ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ناراضی کا عِلم ہُوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دوں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک غریب عیال دار کا نام لیا اور فرمایا یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچا دو۔

(ابو داؤد شریف باب فی اتخاذ الستور)

(۲) حضرت ابوہریرہ اور حضرت اسماء بنت یزید وغیرہما کی رُوایت ہے کہ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے، عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع فرمایا' یہاں تک فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنا دے۔

حضرت خولہ (حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ) نقل کرتی ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عورتوں کو خطاب کرتے ہوتے فرمایا:

"کیا چاندی کے زیورات کی زیبائش کافی نہیں ہے۔ یاد رکھو یہ سونے کے زیور جن کی نمائش کی جاتی ہے دوزخ کا عذاب ہوں گے (ابوداؤد شریف باب ماجائی ذہب النساء)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات بجا ہیں مگر اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت بھی دے دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ان کی زکوٰۃ بلاناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے۔ "خطابی" فرماتے ہیں یہ ممانعت اسلام کے ابتدائی دَور میں تھی۔

(حاشیہ ابوداؤد مجتبائی صفحہ ۲۳ - جلد ۲)

دولت بداماں فقراءِ پاک طینت

ایک تاریخی مُعمّہ اور اُس کا حَل

سنہ ھ میں خیبر فتح ہُوا۔ یہ زرخیز علاقہ تھا، یہودیوں کا گڑھ تھا۔ پُورا علاقہ بحقِ حکومت اسلام ضبط ہُوا۔ مفتوح یہودیوں کو رعایت دی گئی کہ وہ اپنے باغات اور جائدادوں پر بدستور قابض رہیں، البتہ پیداوار کا نصف حکومت کو دیتے رہیں۔ قرآنِ پاک کی خصوصی ہدایات (سورہ فتح، ع ۱) کے بموجب یہ آمدنی (یا یہ پُورا علاقہ) ان مجاہدین کے لیے مخصوص کر دیا گیا جو اس سے پہلے سفر حدیبیہ میں ہمرکاب تھے اور نہایت نازک موقع پر انھوں نے وہ بیعت کی تھی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت اس جنگ میں حاضر تھے ان کی تعداد چودہ سو تھی ان میں سے ہر ایک کا حصّہ مقرر ہو گیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھی حصّہ مقرر ہُوا۔ آنحضرت صلّی علیہ وسلّم کی وسیع ذمہ داریوں کے بپیشِ نظر کتاب اللہ کی ہدایات کے بموجب آپ کا حصّہ عام مجاہدین کی بہ نسبت زیادہ تھا اب وقت آیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کا نفقہ مقرر کر کے سالانہ ادائیگی کا انتظام فرمایا۔

ابو داؤد شریف کی روایت کے بموجب اس کی مقدار ایک سو بیس وسق تھی اور بخاری شریف کی روایت صـــ۳۱۳ـــ کے بموجب ایک سو وسق (۸۰ وسق کھجور اور بیس وسق جَو) ایک وسق کا وزن پانچ من ڈھائی سیر (ساٹھ صاع کا ایک وسق اور تین سیر

چھ چھٹانک کا ایک صاع) اس حساب سے ۸۰ وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس وسق جو ایک سو ایک من دس سیر۔

کھجور اور جَو کا جو نرخ بھی مانا جائے جب ایک شخص کی خوراک کے لیے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جَو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی اور اس کے ذریعے زندگی بہت خوشحال بن سکتی تھی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جملہ محدّثین و مؤرخین مندرجہ ذیل روایتوں پر بھی متفق ہیں اور آفتاب نیم روز کی طرح ان کو ناقابلِ انکار حقیقت سمجھتے ہیں۔

(الف: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ (آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خادم خاص) ازواجِ مطہرات نو تھیں، مگر دن رات کے خرچ کے لیے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع (تین سیر چھ چھٹانک) ہوتا تھا۔ اور ایسا بھی ہُوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جَو منگوائے اور ایسا بھی ہُوا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مَیں جَو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا (اس کے سوا کچھ نہیں تھا) بخاری شریف۔ ص ۲۷۱

(ب) عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ جب بھی مَیں کھانا کھانے بیٹھتی ہُوں طبیعت ایسی بھر آتی ہے کہ اگر چاہوں تو خُوب روسکتی ہُوں۔ مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں آپ دُنیا سے رخصت ہُوئے خدا کی قسم کبھی بھی ایسا نہیں ہُوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہُوئے ہوں۔ (ترمذی شریف۔ ص ۵۸ ج ۲)

(ج) میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ کبھی آپ کے لیے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جَو کا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا۔ یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ ایسے گزر جاتے تھے کہ چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجوریں اور پانی غذا ہُوا کرتی تھیں البتہ انصاری پڑوسی دُودھ بھیج دیا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۹۵۶، ترمذی شریف وغیرہ)

(د) بچھونے کا گدا چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔
(بخاری شریف ص ۹۵۶)

(ہ) اکثر کھُردری چٹائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی پیٹھے جسم پر گڑ جایا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص۲۳۵)

(و) حضرت حفصہ کے یہاں ایک ٹاٹ تھا وہ اسی کو دوہرا کر کے بچھا دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ چوہرا کر کے بچھا دیا۔ جب بیدار ہُوئے تو شکایت کی کہ رات تہجد کی نماز ہی فوت ہوگئی۔ اسی طرح دوہرا کر کے بچھایا کرو۔ (شمائل ترمذی شریف ص۲۳)

حج الوداع کے موقع پر جہاں تقریباً سوا لاکھ جاں نثاروں کا ہجوم تھا۔ اُونٹ پر سوار تھے نیچے پُرانا کجاوہ تھا اور جسم مُبارک پر معمولی چادر جس کی قیمت چار درہم بھی نہیں تھی۔ (شمائل ترمذی ص۲۴)

(ز) وفات ہُوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں تیس صاع جَو کے عوض میں رہن تھی (بخاری شریف ص۴۰۹ وشمائل ترمذی ص۲۳ و ص۲۴ (تیس صاع تقریباً ڈھائی من)

(ح) حضرت ابوہریرہ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگا ہُوا اور ایک موٹے کپڑے کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا کہ ان دونوں میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی روح مبارک قبض ہُوئی تھی۔ (بخاری شریف ص۸۶۵، ترمذی شریف ص۲۰۶ ج ۱)

(ط) وفات شریف کے بعد ترکہ یہ تھا: (ضروری اسلحہ ایک خچر۔ ایک قطعہ اراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا۔ (شمائل ترمذی شریف، ص۲۹)

معمّہ یہ ہے کہ فراخی کے بعد یہ تنگ دستی کیوں؟

حل

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے معمول کی تعبیر ان الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:

"اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کی برابر سونا آجائے تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تیسری رات ایسی آئے کہ میرے پاس اتنے سونے کے علاوہ جو کسی مطالبہ میں ادا کرنا ہو سونے کے پورے پہاڑ میں سے کچھ باقی نہ رہے۔"

(بخاری شریف ص۱۸۹)

ایک روز عصر کی نماز پڑھائی اور جیسے ہی سلام پھیرا، صفوں کو پھاندتے ہوئے تیزی سے راحت کدہ میں تشریف لے گئے۔ نمازیوں کو تعجب ہوا وہ گھبرائے کہ یہ غیر معمولی عجلت کیوں فرمائی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے واپس آکر فرمایا مجھے خیال آگیا کہ کچھ سونا گھر میں ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ سونے کا خیال میری توجہ بٹائے (اور یادِ خدا سے روکے) بس میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم کر دیں۔ (بخاری شریف ص۱۱۱)

آقا کا یہ معمول پوری اُمت کے لیے نمونہ تھا جس کو آقا سے جتنا زیادہ تعلّق تھا اتنا ہی زیادہ اپنے آقا کے عمل کی تصویر بننا چاہتا تھا۔ خصوصاً ازواجِ مطہّرات جن سے وحی الٰہی کی بموجب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم دو ٹوک فرما چکے تھے:

اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الیٰ قوله اَجْرًا عَظِيْمًا (سورۂ احزاب ع۴)

اگر تم دُنیاوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ تمہیں کچھ متاع (مال) دیدوں اور خوبصورتی سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اس کے رسول اور عالم آخرت کو چاہتی ہو (تو دنیاوی بہار کا خیال بھی دِل میں نہ لاؤ، البتہ تمہارا یہ ایثار ایک بہتر کردار ہو گا اور) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان کے لیے جن کا کردار بہتر ہو (اپنے یہاں) بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے $\frac{۳۳}{۲۹-۲۸}$

جملہ ازواجِ مطہرات نے دُنیا اور بہارِ دُنیا کے مقابلہ میں اللہ رسول اور عالم آخرت کو اختیار کیا اور جس طرح نیک کرداری میں آگے بڑھنے کی کوشش کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دَورِ خلافت میں جب ازسرِ نو وظائف مرتّب فرمائے تو ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کے دس ہزار سالانہ مقرر فرمائے تھے۔ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں پہلی مرتبہ رقم پہنچی تو فرمایا اللہ تعالیٰ' امیر المومنین پر رحم فرمائے یہ رقم میرے پاس بھیجدی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی خواتین ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں اور زیادہ مستعدی سے اس دولت کو تقسیم کرسکتی ہیں۔ پیش کرنے والوں نے عرض کیا۔ محترمہ یہ تقسیم کرنے کے لیئے نہیں آپ کے جیب خرچ کے لیے ہے۔ فرمایا' اچھا یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھوا کر ان پر کپڑا ڈلوادیا۔ اور اپنی خادمہ سے فرمایا۔ کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لیے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لیے نکالو۔ فلاں خاندان کے لیے نکالو۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اور ان کے لیے رقومات علیحدہ کراتی رہیں۔ خادمہ نے کہا "سیدہ" میں بھی تو حاضر ہوں۔ کچھ میرے لیے بھی۔ فرمایا جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا۔ خادمہ نے کپڑا اُٹھایا صرف پچاسی درہم باقی رہ گئے تھے وہ اس کو عطا فرمادیے۔

(کتاب الخراج للامام ابی یوسف)

یہ تھیں ازواجِ مطہرات جو بجا طور پر کہہ سکتی "جمال ہم نشیں درمن اثر کرد"۔ جمال ہم نشیں کی دوسری تاثیر ملاحظہ فرمائیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ مجھے گوارا نہیں کہ سونا میری توجہ ہٹائے جس سے یادِ خدا میں رکاوٹ ہو۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اس رقم کو فوراً ہی تقسیم کردیا' مگر پھر بھی دعا کی خدا کرے اس سال کے بعد عمرؓ کا یہ عطیہ مجھے کبھی وصول نہ ہو۔ (جس سے تعلق خداوندی کی دلچسپی اور دلگیری میں فرق آئے)۔

سیاسی رہنما اس دعا کے معنی نہیں سمجھیں گے۔ یہ حضرات اہلِ تصوف کے سمجھنے کی بات ہے جو فرمایا کرتے ہیں:

یک لحظہ غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علمی اور عملی کمالات میں ایک بڑا کمال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کو عطا فرماتا تھا بچا کر نہیں رکھتی تھیں، سب صدقہ کر دیا کرتی تھیں۔

کانت لا تمسک شیئاً مما جاءَ ھا من رزق اللہ الا تصدقت

(بخاری شریف ص ۴۹۷)

ان کی اسی عادت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی مطالعہ فرمائیے جس سے فراخ حوصلگی کے علاوہ زہد، تقویٰ۔ خوفِ خدا اور احتیاط کا بھی اندازہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ مکہ معظمہ میں سریر آرائے خلافت ہوئے تو واجب الاحترام خالہ کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا، مگر محترمہ خالہ کی یہ حالت تھی کہ ابنِ زبیر جو کچھ بھیجتے حسبِ عادت مداتِ خیر میں خرچ کر ڈالتی تھیں۔ بھانجہ کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ خالہ خوش حال زندگی بسر کریں، مگر خالہ کو وہی شانِ نبوی پسند تھی کہ ایک وقت اگر کھائیں تو دوسرے وقت فاقہ کریں۔

ایک روز عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) کو کچھ احساس ہوا۔ انہوں نے شانِ خلافت میں کہہ دیا، خالہ عائشہ یہ غیر معمولی خیرات بند کریں ورنہ ان پر قانوناً پابندی لگا دوں گا۔

لتنتھین عائشۃ اولا حجرن علیھا　(بخاری شریف ص ۴۹۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا کہ بھانجے نے یہ کہا ہے تو قسم کھالی کہ میں ابنِ زبیر سے بات نہیں کروں گی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر خالہ محترمہ کی ناراضگی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ بے چین ہو گئے۔ معافی کی درخواست بھیجی۔ خالہ نے درخواست رد کر دی تو بااثر بزرگوں کو بیچ میں ڈالا۔ بہت کچھ منت سماجت کی، بالآخر معافی ہو گئی اور خالہ نے اپنی قسم ختم کر دی۔

لیکن قسم ختم کرنے کے بعد محترمہ خالہ کو عجیب پریشانی لاحق ہوئی۔ انہوں نے الفاظ یہ کہے تھے: للہ علیّ نذرٌ ان لا اُکلّمَ ابنَ الزُّبیر (اللہ کے لیے میرے

ذمہ نذر ہے کہ میں ابنِ زبیر سے کلام نہیں کروں گی) یہ الفاظ مبہم تھے۔ نذر کی تصریح نہیں تھی کہ نذر کس بات کی۔

حضرات علماء کے لیے تو اس بحث کی بھی گنجائش ہے کہ اس صورت میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) پر کوئی فدیہ یا کفّارہ واجب بھی ہوا یا نہیں، مگر حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) اس طرح کی وسعت برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ غلام آزاد کر دیں، چنانچہ غلام آزاد کر دیا، مگر پھر بھی اطمینان نہیں ہُوا، دوسرا غلام، پھر تیسرا غلام حتیٰ کہ چالیس غلام آزاد کر دیے۔ پھر بھی روتی تھیں کہ میں نے ایسے الفاظ ادا کر دیے جس کے معنی معیّن اور واضح نہیں ہو سکے اور خدا جانے ان الفاظ کا کفّارہ ادا ہُوا یا نہیں۔

(بخاری شریف ص۸۹۷)

کاش میں نے کسی ایسے کام کی قسم کھائی ہوتی، جس کو کر کے فارغ ہو جاتی۔

(بخاری شریف ص۸۹۷)

بہر حال جمال ہم نشیں اور نگاہ یار کی یہ بحث بہت طویل ہے اور یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اشہب قلم کی ہمت نہیں کہ اس طرف قدم بڑھائے، لہٰذا "حدیث از مطرب و مے گو" پر عمل کرنے اور اس تاریخی میدان کو چھوڑنے میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے۔

افلاس کے بعد خوش حالی اور دولت مندی

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور کی ایک جھلک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ دینی خدمات اور فضائل کا تعلق آخرت سے ہے۔ ان خدمات اور کمالات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مرتبے ملیں گے۔

فاما ھٰذا المعاش فالتسویۃ فیہ خیر۔

"معاش میں مساوات ہی بہتر ہے۔"

فقسّم بین النّاس قسما واحداً فکان ذالک نصف دینار لکل انسان۔

سب کے لیے یکساں تقسیم کر دی۔ پس فی کس نصف دینار (پانچ درہم تقریباً اٹھارہ آنے یومیہ مقرر فرمائے۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۳ حدیث ۶۴۶/۶۴۷)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ جب اپنی اپنی استعداد و قابلیت اور صلاحیت کے بموجب قومی اور ملّی خدمت ہر ایک کا فرض ہے تو ادائے فرض کا کوئی معاوضہ نہ ہونا چاہیے البتہ معاشی ضروریات سے استغنا بھی ضروری ہے اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشی ضرورتوں کا تکفل کرے مگر اس کے لیے ایک ہی معیار ہونا چاہیے جو سب کے لیے یکساں ہو۔

بظاہر اس وقت حکومت کی مالی حالت بھی ایسی ہی تھی کہ کسی ایک معمولی معیار پر

ہی سب کی امداد کی جا سکتی تھی۔ حکومت کے مالیہ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ صلاحیتوں اور خدمات کی بنیاد پر کسی کو اس معیار سے بڑھا کر دیا جائے۔

بہرحال بنیادی بات یہاں یہی ہے کہ زندگی کے معیار کو مساوی کیا جائے۔ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو ارکانِ شوریٰ نے آپ کا روزینہ (یومیہ وظیفہ) آدھی بکری مقرر کیا تھا، کیونکہ حضرات مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم) کے خرچ کا اوسط یہی تھا نصف بکری یعنی پانچ درہم، تقریباً ۱۵ پیسے نئے۔ (طبقات ابن سعد بحوالہ تاریخ الخلفاء صہ ۵۸)

یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ملک کے ہر ایک باشندہ کا یہ وظیفہ مقرر کیا گیا تھا، ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ وظیفہ ان کا تھا جو قومی اور ملی خدمات سے تعلق رکھتے تھے (اس کی ادائیگی زکوٰۃ یا صدقات سے نہیں بلکہ حکومت کی دوسری آمدنی سے ہوتی تھی)۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو ترتیب قائم کی اس کی تفصیل "تقسیم دولت" کے سلسلہ میں آئندہ آئے گی (انشاء اللہ)

خوش حالی

اب ہم کچھ آگے بڑھتے ہیں جس تعمیر کی بنیاد مساوات پر رکھی گئی تھی وہ اپنی قدرتی رفتار سے کتنی جلد بلند ہوتی ہے یہ دونوں باتیں قابلِ مطالعہ ہیں۔

سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات سے صرف دس سال بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی مشہور خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں پورے مدینہ میں ایک شخص بھی نہیں رہا جو زکوٰۃ کا مال لینے کے لیے تیار ہو۔ اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی صادق آتی ہے کہ لوگ سونا ہاتھوں میں لیے پھریں گے کہ کسی کو صدقہ کر دیں، مگر کوئی قبول نہیں کرے گا۔ (بخاری شریف صہ ۵۸)

اور لباس و پوشاک کی حالت یہ ہے کہ ایمن حبشیؓ راوی ہیں کہ حضرت عائشہ ایک

سُوتی کپڑے کا کُرتا پہنے ہُوئے تھیں۔ اس کپڑے کو قطری کہا جاتا تھا۔ یہ قیمتی کپڑا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ اس کپڑے کی قیمت ۵ درہم ہوگی مگر اس کی وضع خاص ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، پہلے حالت یہ تھی کہ مدینہ کے تمام مسلمانوں میں اس طرح کا کرتا صرف میرے پاس تھا۔ اس وقت یہ بہت بڑھیا سمجھا جاتا تھا، چنانچہ کسی کے یہاں شادی ہوتی تھی تو دلہن کو پہنانے کے لیے میرے پاس سے کرتا منگایا اور دُلہن کو پہنایا جاتا تھا، لیکن اب حالت یہ ہے کہ میری یہ باندی ہے میں نے اس کے لیے یہ کُرتا گھر میں پہننے کے لیے بنا دیا ہے، مگر یہ نخرے کر رہی ہے، اس کے لیے بھی تیار نہیں کہ گھر میں ہی پہن لیا کرے۔ (بخاری شریف ص۳۵۸)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، تمہارے یہاں قالین ہے؟ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ قالین؟ ہمارے یہاں قالین کہاں؟ فرمایا، عنقریب ہو جائیں گے، چنانچہ آج یہ بشارت آنکھوں کے سامنے ہے۔ گھر میں کئی قالین ہیں۔ میں نہیں چاہتا قالین پر بیٹھوں۔ بیوی سے کہتا ہوں اپنا قالین پرے کرلو۔ بیوی کہتی ہیں کیوں کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی نہیں فرمائی تھی کہ تمہارے یہاں قالین ہو جائیں گے۔ میں یہ سُنتا ہوں تو پڑا رہنے دیتا ہوں، ہٹاتا نہیں۔ (بخاری شریف ص۵۱۲)

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چندہ کی اپیل فرماتے تھے تو ہم منڈی میں جاکر پلّہ داری کرتے (گٹھڑ اُٹھانے کی مزدوری) کرتے تھے۔ مزدوری میں ایک مُد (تقریباً چودہ چھٹانک) کھجور مِل جاتے تھے، ہم وہی لاکر چندہ میں دے دیا کرتے تھے۔ ان مزدوروں میں آج ایسے بھی ہیں کہ ان کے پاس ایک لاکھ کی رقم یونہی پڑی ہُوئی ہے۔ (بخاری شریف ص۳۰۳)

شبیب بن غرقد کی روایت ہے حضرت عروۃ بارقی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دینار دیا کہ قربانی کے لیے بکری خرید لائیں۔

انہوں نے دیکھ بھال اور جستجو کی تو ایک دینار میں دو بکریاں مِل گئیں۔ انہوں نے ایک بکری ایک دینار میں بیچ دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک بکری پیش

کردی اور سالم دینار لوٹا دیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے برکت کی دُعا فرمائی۔
حضرت شبیب فرماتے ہیں کہ انہیں عروہ کے ذاتی اصطبل میں ستر گھوڑے میں نے دیکھے ہیں ۔ (بخاری شریف صـ۵۱۴)
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء نے اپنے بھتیجوں کو ایک جائیداد ہبہ کی اور فرمایا' یہ جائداد بہن عائشہ کے ترکہ میں سے مجھے ملی ہے اور معاویہؓ اس کی قیمت ایک لاکھ روپے دے رہے ہیں ۔ (بخاری شریف صـ۳۵۴)
اور حضرت اسماء اور ان کے شوہر حضرت زبیر رضی اللہ عنہا کے حالات آپ سُنیں تو یقین آنا مشکل ہو ۔ ملاحظہ فرمائیے :

عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت اسماءؓ کی حالت
خود اُن کی زبانی

(جب ہم مدینہ پہنچے تو تہی دست تھے) میرے شوہر زبیر کے پاس صرف ایک لادو (باربردار) اُونٹنی تھی اور ایک گھوڑا تھا ۔ نہ کوئی جائیداد تھی نہ مال تھا ۔ نہ کوئی غلام تھا جو اونٹ اور گھوڑے کی ٹہل کرتا ۔ میں خود جاکر گھوڑے کے لیے گھاس لاتی تھی ۔ پانی پلاتی تھی ۔ اپنے سوتیلے بچّوں کی خدمت کرتی تھی ۔ خود آٹا گوندھتی اور خود روٹی پکاتی تھی تو انصاری بہنیں میری مدد کیا کرتی تھیں ۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کا ایک ٹکڑا زبیر کو عنایت فرمادیا تھا ۔ وہ میرے مکان سے دو ثلث فرسخ (تقریباً دو میل) تھا میں وہاں جاتی اور کھجوروں اور گٹھلیوں کی پوٹ باندھ کر اپنے سر پر رکھ کر لاتی تھی ۔ ایک روز میں سر پر گٹھلیوں کی پوٹ رکھے ہوئے لا رہی تھی کہ راستہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے ۔ آپ اونٹ پر سوار تھے ۔ کچھ انصاری حضرات آپ کے ساتھ تھے ۔ آپ نے مجھے دیکھا تو اُونٹ بٹھالیا اور مجھ سے فرمایا کہ میں

پیچھے بیٹھ جاؤں مگر مجھے شرم آئی کہ مردوں کے ساتھ چلوں اور یہ بھی خیال آیا کہ میرے شوہر زبیر غیور آدمی ہیں انہیں غیرت آئے گی کہ میں بہنوئی کے ساتھ اس طرح اونٹ پر سوار ہو کر آئی۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی میری غیرت کا احساس ہوا۔ آپ نے اصرار نہیں فرمایا۔ آپ انصاری رفقا کو لے کر تشریف لے گئے۔

میں نے گھر پہنچ کر حضرت زبیر کو یہ قصّہ سنایا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ آپ غیور آدمی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ آپ کو غیرت آئے گی۔

حضرت زبیر نے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک اُونٹ پر سوار ہو کر چلنے سے زیادہ میرے لیے غیرت کی بات یہ ہے کہ تم گٹھلیوں کی پوٹ سر پر رکھ کر لاتی ہو۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر خدا نے میرے والد حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو توفیق دی کہ انہوں نے ایک غلام بھیج دیا، جس نے گھوڑے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ گویا اس نے مجھے آزادی بخش دی۔ (بخاری شریف ص۷۸۶)

بے شمار دولت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف سے تقریباً ۲۵ سال بعد جنگ جمل میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مجروح ہو کر شہید ہوئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر اس عرصہ میں جیسے جیسے خوش حالی آتی رہی دوسروں کو خوش حال کرنے کا جذبہ بھی بڑھتا رہا۔ آپ کی ذاتی آمدنی کا مدار صرف ان چند جائدادوں پر تھا جو بسلسلہ غزوات ان کے حصے میں آئی تھیں لیکن مدات خیر میں خرچ کا یہ عالم تھا کہ جب وفات ہوئی تو بائیس لاکھ کا قرض اُن کے ذمہ تھا لوگ ان کے پاس امانت رکھواتے تھے، مگر حضرت زبیر فرما دیا کرتے تھے کہ میں امانت نہیں رکھتا۔ قرض دے دو تاکہ میں خرچ کر سکوں۔ اس طرح بائیس لاکھ کی امانتیں تھیں جو قرض ہو گئی تھیں آپ نے وفات اپنے نامور فرزند عبداللہ کو وصیت

فرمائی کہ میرے ترکہ میں سے پہلے قرض ادا کرنا اور اگر دشواری محسوس کرو تو میرے آقا سے درخواست کرنا وہ ضرورت پوری کردے گا۔ صاحبزادے نے دریافت کیا کہ آپ کے آقا کون ہیں؟ فرمایا: "اللہ تعالیٰ"۔

بہرحال تقسیم ترکہ کے وقت جو صورت پیش آئی وہ حیرت انگیز ہے۔ خود حضرات مؤرخین اور اہلِ سیر حیرت زدہ ہیں۔ امام بخاریؒ نے اس کو خصوصی برکت اور کرامت قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وفات کے وقت اگرچہ نقد ایک درہم بھی نہیں تھا مگر جائیداد کی تفصیل یہ تھی۔

مدینہ طیبہ میں گیارہ مکان (حویلی) بصرہ میں دو حویلی۔ کوفہ میں ایک حویلی۔ مصر میں ایک حویلی اور مدینہ طیبہ کے قریب غابہ مقام تھا وہاں دو جائیدادیں تھیں۔

یہ تھے وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جن کے پاس ایک اُونٹ ایک گھوڑے کے سوا کچھ نہ تھا اور جن کی اہلیہ محترمہ "اسماءؓ" گھوڑے کا دانہ چارہ خود اپنے سر پر رکھ کر دو میل سے لاتی تھیں۔

برکت اور کرامت

حضرت عبداللہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی شہادت کے بعد جائداد کا اندازہ کیا گیا تو بڑے بڑے لوگوں کا جو جائیدادوں کے مالک تھے اور جن کو قیمتوں کا اندازہ تھا ان کا خیال یہ تھا کہ تمام جائیداد کی قیمت ایک لاکھ بھی مشکل سے بنے گی، لیکن غابہ کی زمینوں کے پلاٹ بنا کر میں نے فروخت کرنے شروع کیے تو اندازہ سے کہیں زیادہ قیمتیں وصول ہوئیں۔ اور پھر جب آقا کا حوالہ حضرت زبیر نے اپنی وفات کے وقت دیا تھا اس آقا نے یہ برکت عطا فرمائی کہ میں نے بائیس لاکھ کا قرض ادا کیا۔ چار سال تک حج کے موقع پر عام اعلان کراتا رہا کہ حضرت زبیر کے ذمہ کسی کا کوئی مطالبہ ہو تو مجھ سے وصول کرلے۔ جب اطمینان ہوگیا کہ کسی کا کوئی مطالبہ باقی نہیں رہا تو میں نے ایک تہائی

ترکہ حضرت رضی اللہ عنہ کی وصیت کے بموجب مستحقین کو دیا۔ باقی دو تہائی وارثوں کو تقسیم کیا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں تھیں۔ ہر ایک اہلیہ محترمہ کو دس لاکھ بیس ہزار نقد ملا۔ اور کل ترکہ کی مجموعی قیمت پانچ کروڑ دو لاکھ فراہم ہوئی۔

(بخاری شریف ص۴۴۱ و ص۴۴۲

فنا میں بقا ـــــ ایک فریب نظر

لازوال بحث

دو کلمے ہیں۔ سبحان اللہ والحمد للہ ۔ زبان نے حرکت کی اور یہ کلمے (بول) سُنے گئے۔ حرکت ختم ہوگئی، آواز بھی ختم ہوگئی مگر کیا یہ الفاظ بھی ختم ہوگئے جو زبان سے صادر ہوئے تھے۔

پُوری دُنیا ہمیشہ اسی فریب میں مبتلا رہی کہ یہ الفاظ ختم ہوگئے۔ فلاسفہ اور منطقی حضرات اپنی چمکتی ہُوئی دلیلوں سے یہی ثابت کرتے رہے کہ الفاظ اعراض ہیں جن کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی کسی دوسری چیز کے سہارے ان کا نمائشی وجود ہوتا ہے جو آناً فاناً ختم ہوجاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "سبحان اللہ والحمد للہ تملاٰن مابین السماء والارض" سُبحان اللہ اور الحمدُ للہ اس تمام فضا کو پُر کر دیتے ہیں جو آسمان اور زمین کے بیچ میں ہے۔

یہ ایک ایسی ہستی کا اعلامیہ تھا جو کائنات کا حقیقت شناس ہے اور ہم اس کو رسول برحق مانتے ہیں۔ مگر ہماری فلسفہ زدہ شکی طبیعت اس ارشاد کی تاویل و توجیہہ کرتی رہی اور کبھی ایسا بھی ہُوا کہ یہ حدیث پڑھتے ہُوئے ہمیں جھجک ہُوئی کہ محققین فلسفہ و سائنس ہمیں اوہام پرست کہیں گے (معاذ اللہ)

بیسویں صدی کے سائنس دانوں کو خدا ہدایت نصیب کرے انہوں نے خود اپنے اماموں اور پُرانے استادوں "فلاسفہ قدیم" کی تردید کی۔

سات سمندر پار امریکہ کی راجدھانی واشنگٹن سے ایک شخص ریڈیو پر بولتا ہے۔ دُنیا کے ہر گوشے سے اُس کے الفاظ سُن لیے جاتے ہیں۔ کیا بولنے والے کے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ فنا ہو گئے تھے۔ اگر فنا ہو گئے تھے تو یہ فضا ان الفاظ سے کیسے بھر گئی۔ یا بجلی کی لہروں نے ان الفاظ کو دُنیا کے ہر گوشہ میں کس طرح پہنچا دیا۔ اگر یہ ختم اور فنا ہو گئے تھے۔

تقریر کرنے والے یا بولنے والے کے قریب آپ نے چھوٹا سا آلہ رکھ دیا آپ کی تمام تقریر اور تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ تقریر کرنے والے کی وفات ہو گئی، مگر اس کی تقریر کا یہ ریکارڈ موجود ہے جب چاہیں آپ سُن سکتے ہیں۔ کیا عجب ہے اس طرح کی کوئی قوت قدرت نے خود ہماری آنکھ ناک اور ہماری جلد اور بدن کے حصّہ میں رکھ دی ہو اور نہ رکھ دی ہوتی تو ہم باہر بھی اس کا ادراک کیسے کر سکتے؟ جبکہ ہم میں اس کیفیت کا شعور ہی نہ ہوتا، اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں یہ کیفیت ہو۔ بس جب ہم میدانِ حشر میں داورِ محشر کی عدالت میں اپنے کسی قول یا فعل سے انکار کریں تو ممکن ہے کہ ہمارے اعضاء کا یہ مخفی ریکارڈ دفعتہً بجنے لگے اور ہمارا پول کھول دے۔ کما یشیر الیہ قولہ تعالےٰ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ (الآیۃ۔ سورۃ سجدہ، ع ۳)

اور ملاحظہ فرمائیے کسی شرارت پسند بد زبان نے یا کسی نیک اور سنجیدہ بزرگ نے غصّہ سے بے تاب ہو کر کسی کو گالی دے دی۔ پھر زبان رُک گئی۔ الفاظ ختم ہو گئے۔ فضا میں خاموشی چھا گئی مگر کیا گالی کے الفاظ کی تاثیر بھی ختم ہو گئی اگر شاعر اپنی عربی زبان میں کہا تھا:

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ   وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

نیزے کے زخم بھر جاتے ہیں مگر وہ زخم   نہیں بھرتا جو زبان نے لگایا ہو

فنا میں بقا۔ جس کی چند مثالیں پہلے گزریں۔ حرف زبان کے فعل اور زبان کی حرکت

تک ہے یا انسان کے ہر فعل کی یہی خاصیت ہے کہ بظاہر ختم ہو جاتا ہے مگر واقعہ اور حقیقت کے لحاظ سے کبھی ختم نہیں ہوتا ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہے یعنی ہمارے مشاہدہ کی بات ہے کہ جب تک انسان کا سانس باقی ہے عمل کی تاثیر ختم نہیں ہوتی۔

تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ فردوسی نے جب سلطان محمود غزنوی کی فرمائش کے بموجب ساٹھ ہزار شعروں کا "شاہنامہ" لکھ کر پیش کر دیا تو اوّل تو اپنی قرارداد کے بموجب انعام دینے میں محمود غزنوی کو تامل ہوا۔ بالآخر جب یہ طے کر لیا کہ جو انعام (فی شعر ایک دینار) طے ہوا تھا وہ ادا کرنا ہے تو انعام کی رقم فردوسی کے مکان کی طرف چل رہی تھی اور فردوسی زندگی کے سانس پورے کر کے قبرستان جا رہا تھا۔ (اللہ بس باقی ہوس)

مطلب یہ ہے کہ فردوسی نے جو فعل کیا تھا اس کی تاثیر نہ صرف اس کی زندگی کے آخری سانس تک باقی رہی بلکہ اس کی وفات کے بعد بھی باقی رہی اور کہہ سکتے ہو کہ اتنی تاثیر آج تک باقی ہے کہ ہر صاحبِ نظر کی نظر میں فردوسی قابلِ احترام ہے اور سلطان محمود پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے وعدہ پورا کرنے میں پس و پیش کیوں کیا؟

اچھا جب ہم نے کہا کہ انسان ختم ہی نہیں ہوتا۔ موت فنا نہیں ہے بلکہ انتقال ہے۔ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف تو کیا درست ہوگا کہ "عمل انسان" کو ختم مان لیا جائے اور اسے منتقل شدہ نہ مانا جائے جس کے اثرات یہاں بھی رہیں اور وہاں بھی ہوں۔

ہاتف غیبی وحی کے ذریعہ انسان کو یہی تنبیہہ کرتا رہتا ہے اور یہی آگاہی دیتا رہتا ہے: "غافل جس طرح موت سے تیری فنا نہیں ہے تیرے عمل کو بھی فنا نہیں ہے۔"

یہاں ہم ان کو نہیں مانیں گے جن کو انسانی ترقی اور انسانی تنزّلی کا فرق بھی معلوم نہیں ہے جن کی ترقی کا اُلٹا اثر یہ ہے کہ نوعِ انسان دولتِ اطمینان سے محروم ہے اور

جیسے جیسے ترقی کی رفتار تیز ہو رہی ہے بے اطمینانی اور آپس کی بے اعتمادی بڑھ رہی ہے۔ خوف و ہراس کی وبا پھیل رہی ہے، انسان کو انسان سے نفرت ہو رہی ہے اور جذبات عداوت میں بحران پیدا ہو رہا ہے۔ دعویٰ ہے دانش مندی اور ہمہ دانی کا، مگر دانش وری یہ ہے کہ خود اپنی خبر نہیں کہ وہ کیا ہیں۔

باہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر (جگر مراد آبادی)

ایک صاحب فرماتے ہیں اور صحیح فرماتے ہیں:

نور و نار بھی شامل ہے، سوز و ساز بھی داخل ہے
جانے کیا کیا ترکیبیں ہیں اجزائے انسانی میں
یہ کھٹکا سا ہے کیا؟ آخر جس کے سہارے جیتا ہوں
حال دُنیا معلوم ہو کیا؟ جب حالِ دل معلوم نہیں (گوپی ناتھ امن)

ایک دانش مند کے خیال میں دانش وری یہی ہے کہ نادانی کا اعتراف کیا جائے۔

تا بد انجا رسید دانش من
کہ بدانم ہمی کہ نادانم (ابو شکور بلخی)

یہاں ہم صرف ان کی بات مانیں گے جن کے متعلق دُنیا کے دانش ور اور دانش مند مانتے ہیں کہ قدرت نے ان کو پیدا ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ انسان کو آگاہ کریں کہ انسانیت کیا ہے؟ آدمیت کسے کہتے ہیں، اس کا کیا مقصد ہے اور وہ کیا فرائض ہیں جو اس پر عاید ہوتے ہیں۔

دُنیا میں ہر فن کے ماہر ہوتے ہیں اس فن سے ان کو دلچسپی ہوتی ہے اور ان کا نشو و نما ابتدا سے ایسا ہوتا ہے جو اس فن کے مناسب ہوتا ہے۔ انسانیت کی تشخیص، انسانیت کا بناؤ سنوار یہ بھی ایک فن ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں اس کے ماہر گزرے ہیں۔ انہوں نے انسان کو پہچانا۔ انسانیت کو پہچانا۔ اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو معلوم

کیا۔ خوبیوں کو بڑھانے اور خرابیوں کو دُور کرنے کی ترکیبیں بتائیں۔ نسخے ایجاد کیے۔ مذہب کی زبان میں ان کو نبی کہتے ہیں۔ ہم ان سب کا احترام کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہم ان سے دریافت کریں گے کہ عمل کا تعلق عمل کرنے والے سے کیا ہوتا ہے وہ ختم ہونے والی چیز ہے یا پتھر کی لکیر ہے جو ہر انسان پر کندہ ہو جاتی ہے کیا عمل کا بھی ایک عالم ہے اور جس طرح ہمارے الفاظ فضا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنا وجود رکھتے ہیں یہ عمل بھی اپنی خصوصیات اور تاثرات کے ساتھ اپنا وجود رکھتے ہیں۔

روحانیت کے ماہرین اور شرافت و انسانیت کے ان فن کاروں نے جن کو نبی کہا جاتا ہے بالاتفاق ایک ہی بات بتائی تھی مگر ان کی بتائی ہوئی باتیں لوگوں کو یاد نہیں رہیں، کیونکہ انہوں نے ان کو اپنے زمانہ میں لکھوایا نہیں تھا اور اگر کسی نے کچھ لکھوا دیا تو وہ گم ہو گیا۔ یا جس زبان میں لکھوایا ہو گا وہ زبان محفوظ نہیں رہی۔ ہاں ایک چیز بالکل محفوظ ہے اس کو اسی وقت لکھوا دیا گیا تھا جب اس کا نزول ہوا تھا۔ لکھوانے کے ساتھ یاد بھی کرا دیا تھا، چنانچہ وہ ابتدا سے لے کر آج تک صحیفوں اور تحریروں میں بھی محفوظ چلا آتا ہے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کے سینوں میں بھی اُسی طرح محفوظ ہے یہ قرآنِ حکیم ہے جو صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مجموعہ نہیں بلکہ ان تمام مقدس انسانوں کی تعلیمات کا محفوظ مجموعہ ہے جو روحانیت کے ماہر اور انسانیت کے مُعلّم بن کر دُنیا میں آئے۔ وہ دُنیا سے الگ رہتے ہوئے دُنیا والوں کی اصلاح کرتے رہے۔ نوع انسان کی درستی اور انسانیت کے سدھار میں انہوں نے اپنی پاک زندگیاں صَرف کیں۔ ان مقدس اور پاک بزرگوں نے جو بتایا وہ عقل سے بعید بات نہیں بلکہ رات دن کا ہمارا مشاہدہ ہے، ہم دیکھتے ہیں۔ تجربہ کرتے ہیں۔ مگر غور نہیں کرتے۔

مشاہدہ

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان جس طرح مختلف عناصر کا مجموعہ ہے اسی طرح اس کے ذہن اور دماغ کا چھوٹا سا سُوٹ کیس یا فائل بکس۔ بہت سی صلاحیتوں کا سیف و خزانہ ہے، ہر ایک صلاحیت اپنے اپنے خانہ میں سجی ہُوئی ہے۔ انسان جس کو بڑھانا چاہے بڑھا سکتا ہے۔ بڑھانے والی چیز پریکٹس ہے (مشق یعنی مسلسل عمل) مشق سے پہلے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے مگر تعلیم صلاحیت کو بڑھاتی نہیں اس کو بیدار کرتی ہے اور اس کا رُخ کرتی اور راستہ مقرر کر دیتی ہے۔

ریت اور کنکریوں سے کھیلنے والا بچہ، بڑا ہُوا تو وہ طبیب حاذق یا ڈاکٹر تھا۔ اس کی فطرت میں ایک صلاحیت تھی تعلیم نے اس کو بیدار کیا، چمکایا۔ اس کو طبابت اور ڈاکٹری کے راستہ پر لگایا۔ اور رات دن کی مشق اس کی صلاحیت کو پختہ کر دیتی ہے۔ مرض کی تشخیص کر کے وہ نسخہ تجویز کرتا ہے۔ مریض شفایاب ہوتا ہے اور اس کا تجربہ بڑھتا ہے اور صلاحیت پختہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ طبابت اس کا مزاج بن جاتی ہے۔

رب اور پروردگار کا اعتراف فطری جوہر ہے۔ تعلیم نے اس کو روشن کیا۔ پھر تعلیم پر اس نے عمل کیا تو یادِ خدا اس کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی اور وہ ایسا ہو گیا کہ دُنیا والے اس کو دیکھتے ہیں تو ان کو بھی خدا یاد آجاتا ہے۔ جلاد کو جب پہلی مرتبہ قتل کرنے یا پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیا گیا۔ اس کو بہت جھجک ہُوئی۔ گویا خود اس کو پھانسی دی جا رہی ہے لیکن جب یہ عمل بار بار کیا گیا تو جھجک کے بجائے اس کو مزا آنے لگا۔ اس کی طبیعت جلاّد بن گئی اور اب اس کی صورت دیکھتے ہیں تو خوف معلوم ہوتا ہے۔

دُنیا کے ان تمام مقدس بزرگوں نے جن کو نبی کہا جاتا ہے۔ یہی بتایا ہے کہ انسان کا کوئی عمل رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ انسان کی صلاحیت پر اثر ڈالتا ہے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اچھے عمل کرنے والا انسان اچھا ہو جاتا ہے۔ بُرے

عمل کرنے والا انسان بُرا بن جاتا ہے۔ جیسا بوتا ہے ایسا ہی پھل پاتا ہے۔ ببول کے بیج بو کر انگور کے خوشوں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

سرمایہ ختم کیا جائے یا مُنجل؟

عمل اور رُوح کا رابطہ۔ ماہرینِ رُوحانیت کا فیصلہ

ہم شُکر گزار ہیں سائنس جدید کے۔ اس نے مشاہدہ کرا دیا کہ ہماری زبان اور ہمارے ہونٹوں کا عمل فنا نہیں ہوتا یعنی جو الفاظ زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے صادر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ ان کا وجود قائم رہتا ہے۔ ٹیلی ویژن نے مشاہدہ کرا دیا کہ ہاتھ پاؤں کے عمل اور ان کی حرکت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس وجود کا عکس بھی پڑتا ہے۔ پس ہمارا یہ خیال یقیناً غلط ہے کہ عمل کا اپنا وجود کچھ نہیں ہے، بلکہ تحقیق یہ ہے کہ عمل اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔

محققین سائنس یہ نہیں بتا سکے کہ اس وجود کا تعلق جس طرح فضا سے ہے آیا ہماری باطنی قوتوں اور ہماری اس حقیقت سے بھی اس کا کچھ تعلق ہے جس کو روحانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو موت پر فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔

سائنس کے اصحاب تحقیق شاید اس سوال کا جواب آئندہ بھی نہ دے سکیں، کیونکہ رُوح روحانیت اور مابعد الموت ان کا موضوع نہیں ہے۔ ان کا موضوع وہ مادہ ہے جو عالمِ مشاہدہ میں اس وقت موجود ہے، لیکن ہمارا وجدان شہادت دیتا ہے کہ عمل کے وجود کا تعلق ہماری روحانیت سے یقیناً ہے اور بہت گہرا تعلق ہے ہمارا عمل خود ہمارے اندر کبھی مسرت اور خوشی کی لہر دَوڑا دیتا ہے اور ہماری رُوح کو مطمئن

کر دیتا ہے اور کبھی ہمارا عمل ہمارے اندر غم، پریشانی اور اضطراب و بے چینی کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔

اگر عمل کا تعلق روحانیت اور ان معنوی قوتوں سے نہیں ہے جو ہمارے اندر موجود ہیں تو پھر اس اضطراب و بے چینی۔ یا سکون اور اطمینان کی وجہ کیا ہے؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کسی عمل پر ہم مسرور اور مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور کسی پر ہم پچھتاتے اور غمگین ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔

روحانیت کے وہ ماہر جن کی پیدائش ہی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ روحانیت کی باتیں بتائیں، چنانچہ شروع ہی سے ان پر روحانیت کا غلبہ یہاں تک رہا کہ کبھی ان سے روحانیت اور سچائی اور اعلیٰ اخلاق کے خلاف کوئی فعل سرزد نہیں ہوا جن کی فطری بیداری اور قدرتی فکر و بصیرت کا یہ عالم رہا کہ کبھی کسی نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تو کیا کسی مکتب اور پرائمری اسکول میں بھی تعلیم نہیں پائی اور اس کے باوجود انہوں نے نوعِ انسان کو وہ سبق دیے کہ ان کی بنیاد پر اعلیٰ اخلاق، شریفانہ کردار، انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن عالم کے بنیادی اصول مرتب کیے گئے جن کو اقوامِ عالم نے ضابطۂ حیات بنایا اور دُنیا کے دانش وروں نے ان سے ہر طرح کے قانون اخذ کیے۔ یہ اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل روحانیت کے اعلیٰ ترین ماہر جن کو نبی کہا جاتا ہے وہ بہت پہلے سے بلکہ ہمیشہ سے یہی بتاتے رہے ہیں کہ ہر عمل ایک وجود رکھتا ہے۔ اس اس کی خاصیتیں ہوتی ہیں اور اس کے اثرات ہوتے ہیں جو عمل کرنے والے کی روحانیت سے پیوست ہو جاتے ہیں۔

ہمارے وجدان کی شہادت یہ ہے کہ عمل کی طرح ہماری خصلتوں کا بھی وجود ہے اسی لیے ان کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ رحمدل کا چہرہ اس کے دردِ دل کی شہادت دیتا ہے۔ جفا کار اور سنگ دِل کو آپ اس کے چہرے سے پہچان لیتے ہیں اگر وفا اور جفا کا کوئی اپنا وجود نہیں ہے تو چہرے پر یہ آثار کیسے ہیں؟

اسی اصول کو اور آگے بڑھائیے۔ بخل اور سخاوت۔ فطرتِ انسان کی دو خصلتیں یا دو وصف ہیں ان کی کچھ خصوصیات ہیں کچھ لوازم و تاثیرات ہیں۔ بخل کے لیے حرص، طمع، تنگ نظری، خود غرضی، بزدلی، بے رحمی اور سنگ دلی لازمی صفات ہیں جن کے نتیجہ میں ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت، خیانت اور سُود جیسے زہریلے جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو عوام کی خوش حالی کو ڈستے ہیں اور ان میں بے اطمینانی اور پریشان حالی کا زہر پھیلا دیتے ہیں۔

بخل کے مقابلہ پر سخاوت ہے جو دِل کی بہادری اور حوصلہ کی بلندی چاہتی ہے۔ طبیعت میں بے نیازی پیدا کرتی ہے۔ دوسروں کی ضرورتوں کا احساس ان کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا سخاوت اور جود و کرم کی اصل روح ہے۔ یہ روح کارفرما ہوتی ہے تو ہمدردی۔ غمخواری۔ رحم اور خدمتِ خلق کے جوہر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یعنی انسانیت کا جوبن نکھرتا ہے۔ شرافت کا جھنڈا بلند ہوتا ہے۔ میل ملاپ اور محبت کی فضا ہموار ہوتی ہے۔ سخاوت اگر کارفرما ہو تو طبقاتی جنگ کی نوبت نہیں آتی، کیونکہ دولت مند طبقہ ہمدرد و غمگسار ہوتا ہے۔ اور غریب و نادار اس کے وفادار و جاں نثار ہوتے ہیں اور اس طرح ایک ایسا نظم و ضبط قائم ہو جاتا ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہوتا ہے جو معاشرہ اور سماج کو اطمینان کی دولت بخشتا ہے۔ جس میں ایک دوسرے سے نفرت اور بغض نہیں بلکہ محبت اور باہمی اعتماد کی نعمت میسّر آتی ہے اور جب محبت اور اعتماد و تعاون کی کلیاں چٹختی ہیں تو معاشرہ اور سماج۔ رواداری اور شریفانہ اخلاق کا گلدستہ بن جاتا ہے۔ ہر ایک مذہب اسی تہذیب کی حمایت کرتا ہے اور یہی تہذیب بہیمیت اور حیوانیت کو کچلتی ہے اور شرافت و آدمیت کو سربلند کرتی ہے جس سے رب العالمین کی نیابت و خلافت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے اور دُنیائے پُرمحن جنت نشان بن جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السّلام اس عالم مشاہدہ (کائنات) کے پس منظر سے بھی واقف

ہوتے ہیں اور اس کا مستقبل بھی ان کی دقیقہ رس نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ جماعت انبیاء کے قائدِ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل و کردار اور ان کی تاثیرات و خصوصیات کے فلسفے کو سامنے رکھ کر ہمیں آگاہ کیا ہے کہ جس طرح بخل کے نتائج یعنی ذخیرہ اندوزی، افراطِ زر کی ہوس اور سود وغیرہ انسانوں کی خوشحالی کو ڈستے ہیں تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ وہ سرمایہ جو بخل کا مُعمل ہے خود ایک اژدھا بن جائے گا۔ جو صاحبِ دولت کے گلے کا طوق بن کر اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں ہوں تیرا مال۔ میں ہوں تیری دولت۔

گذشتہ سال جب چین نے ایک ایٹم بم کا تجربہ کیا تھا تو کروڑوں اربوں انسانوں میں صرف چند ہی افراد ایسے تھے جن کو یہ مہارت حاصل تھی کہ انہوں نے اس ریڈیائی خاک کو محسوس کر لیا تھا۔ جس کے متعدی اثرات۔ انسان کی ہڈیوں تک پہنچ سکتے ہیں اور ان میں کینسر پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم نے ان کی تکذیب نہیں کی بلکہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم روحانیت کے ان مقدس ماہرین کا شکریہ ادا کریں جنہوں نے ہمیں بخل کی اس تاثیر سے آگاہ کیا اور ہمیں متنبہ کر دیا کہ یہ سنہرا روپہلا سرمایہ اژدھا بن جائے گا۔ اگر اس پر بخل کا عمل ہوتا رہا۔

سرمایہ ختم کیا جائے یا بُخل

اسلام اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کرتا کہ دولت صرف ایک معمل یا ایک آلہ ہے اصل چیز دولت نہیں ہے بلکہ عمل اصل ہے۔ چشمہ شیریں کے پانی سے آپ لالہ زار کو شاداب کر کے سنبل و ریحان کے تختے اور خیابان بھی تیار کر سکتے ہیں اور خارستان کے خاردار جھاڑوں کو بھی دھاردار اور نوکیلے بنا سکتے ہیں۔ نتیجہ کا تعلق آپ کے عمل سے ہے۔ معمل یعنی چشمہ کے پانی سے نہیں ہے۔ بس اصلاح یہ نہیں ہے کہ آپ چشمہ کو

خشک کردیں یا اس کے پانی کو لالہ زار کے بجائے کسی خندق میں بہادیں۔ اصلاح یہ ہے کہ کانٹوں سے نفرت دلائیں اور گل و غنچہ کی محبت بڑھائیں اسلام اصلاح کی یہی صورت اختیار کرتا ہے وہ جود و سخا کے چمن و گلشن کو اتنا بڑھاتا ہے کہ خارستان بخل ختم ورنہ زیادہ سے زیادہ تنگ ہو جائے۔ نہ صرف اسلام بلکہ ایشائی تہذیب کا اصولی سبق یہی ہے۔ وہ سخاوت اور جود و کرم کو انسانیت کا سب سے بہتر جوہر اور بخل کو لعنت اور سراسر لعنت قرار دیتی ہے۔

سخاوت مس عیب را کیمیا ست
سخاوت ہمہ درد ہا را دوست (شیخ سعدیؒ)

سخیاں ز اموال برمے خورند
بخیلان غم سیم و زرمے خورند
نیرزد بخیل آن کہ نامش بری
دگر روزگارش کند چاکری (شیخ سعدیؒ)

بخل اور نفع اندوزی کا مقام اور راستہ

لیکن قرآنِ حکیم جو خالقِ فطرت کا کلام پاک ہے وہ اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ بخل کی مذمت اور سخاوت کی تعریف کر دے۔ وہ جس طرح سخاوت و بخل کی خصوصیات سے واقف ہے۔ وہ انسانی نفسیات سے بھی باخبر ہے صرف منفی پہلو پر اس کی نظر نہیں رہتی وہ مثبت کے اثبات کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کوئی تعلیم جس کی بنیاد حقائق پر ہو۔ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ بخل اور ذاتی مفاد کی حرص و طمع اگرچہ قبیح اور قابلِ نفرت ہے مگر انسان کی فطرت میں لامحالہ داخل ہے اور اس کا جزء ہے۔ اسی کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان سخت سے سخت

محنت کرتا ہے اور منفعت حاصل کرتا ہے۔ اگر ذاتی مفاد کے حرص کی جڑیں بالکل اکھاڑ دی جائیں تو محنت و مشقّت کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا اور انسانیت ترقی کی تمام منزلوں سے محروم ہو جائے گی جو تعلیم انسانی فطرت کی اس خصوصیت کو نظر انداز کر کے حرص اور ذاتی مفاد کے شوق کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے اس کو تعلیم فطرت اور اس دین کو دین فطرت نہیں کہا جا سکتا جو اس طرح کی تعلیم کا معلّم ہو۔ اسلام ذاتی مفاد کے طبعی شوق کو ختم نہیں کرتا، البتہ اس کو حقیقت پسند بناتا ہے۔

ذاتی مفاد کا شوق۔ دولت کی صرف حفاظت پر ہی آمادہ نہیں کرتا، بلکہ اس کی عمر کو زیادہ طویل کرنا چاہتا ہے اور اس کی آخری منشا یہ ہوتی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے وہ ایک لازوال نعمت بن جائے جس کو زمانہ کی کوئی گردش فنا نہ کر سکے۔

قرآن حکیم اسی نقطہ کو سامنے رکھتا ہے اور فنا و بقا کے فلسفہ کو ذہن نشین کرا کے اس حقیقت کا یقین پیدا کراتا ہے کہ دولت کا بقا تجوریوں میں بند کرنے اور زمین دوز خزانوں میں دفن کرنے سے نہیں بلکہ اس کے بقاء کی صورت یہ ہے کہ اس پر انفاق فی سبیل اللّٰہ کا عمل زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ بینک بیلنس آپ کا کتنا ہی زیادہ ہو اس کی بقا اور بچت زیادہ سے زیادہ اس وقت تک ہے جب تک آپ میں لکھنے پڑھنے یا بولنے چالنے کی طاقت ہے۔

اس بچت کو آپ مابعد الموت کی زندگی کے لیے بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کو بینک کے کھاتہ میں نہیں، بلکہ اپنے نامۂ اعمال کے رجسٹر میں مدِ خیر کے کھاتہ میں جمع کرائیے۔ جو فنڈ تمہاری حفاظت میں ہے اس کو بقاء نہیں۔ بقاء اس کو ہے جو محافظ حقیقی کی حفاظت اور اس کی نگرانی میں ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ

(سورۂ نحل، ع ۱۳)

ترجمہ: جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے یہاں ہے وہ باقی ہے وہ دائم ولازوال ہے۔ ۱۶/۹۶

یہ ہے فنا میں بقاء کا فلسفہ۔

آپ بینک میں رقم ڈیپازٹ کراتے ہیں کہ رقم محفوظ رہے اور اس کا انٹرسٹ (سُود) آپ کو ملتا رہے لیکن یہ ڈیپازٹ رقم آپ کی کب تک ہے؟ اپنی دانست میں آپ نے بڑی دُور اندیشی سے کام لیا کہ زندگی کا بیمہ کرا دیا، مگر کیا بیمہ قضا و قدر کے فیصلہ میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہے؟

عدالت نے کسی کو دیوالیہ قرار دے دیا ہے تو وہ کسی وقت دولت مند بھی بن سکتا ہے لیکن جس کو قضاء وقدر نے دیوالیہ قرار دے دیا جو دُنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہُوا وہ کبھی دولت مند نہیں بن سکتا، البتہ اگر آپ نے قرآنِ حکیم کے اصول پر اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیا ہے تو اب آپ کی دولت پر کبھی زوال نہیں آسکتا یہ دولت دن بدن بڑھتی ہی رہے گی۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا الخ (سورۂ مزمّل ع ۲)

ترجمہ: اور جو آگے بھیجو گے اپنے واسطے کوئی نیکی اس کو پاؤ گے اللہ کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ ۲۰/۲۹

ڈیپازٹ رقم پر آپ کو چار پانچ فیصدی سُود ملتا ہے، لیکن جو رقم آپ فی سبیل اللہ کے بینک میں جمع کراتے ہیں اس کے نفع کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم یہاں بھی فلسفہ ارتقاء جاری کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی وضاحت یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے بینک میں جو رقم جاتی ہے اس کو صرف کھاتہ میں درج نہیں کر دیا جاتا، بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کو تخم بنا کر ایک زرخیز کشت زار میں بو بھی دیا جاتا ہے۔ زرخیز زمین میں گیہوں کی ایک نال پر سات بالیں آجاتی ہیں اور ایک ایک

بال (خوشہ) میں سو سو دانے ہوتے ہیں تو ایک دانہ سے سات سو دانے ہو جاتے ہیں یعنی انٹرسٹ (نفع) ستر ہزار فیصد ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ (سورۂ بقرع ۳۶ ۲/۲۶۱)

لیکن شرط یہ ہے کہ دولت مند جو امداد کرے اس میں خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کو کبھی زبان پر بھی نہ لائے۔ جس سے غریب اور ضرورت مند کو کمتری کا احساس ہو یا کوئی ذہنی اور دماغی کوفت ہو۔

قرآن حکیم نے تنبیہ کر دی ہے کہ:

جو شخص اپنا کوئی ذاتی مفاد سامنے رکھتا ہے یا احسان جتانے کے لیے اس کو زبان پر لاتا ہے وہ اپنے عمل کو خود برباد کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے اس مٹی میں بیج بو دیا جو کسی چٹان پر جم گئی تھی بارانِ رحمت کی بوندیں جو کشت زار میں تخم کو نشو و نما بخشتی ہیں ان کا عمل یہاں یہ ہوتا ہے کہ وہ چٹان کے اُوپر سے مٹی بہا دیتی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بیج بھی بہہ جاتے ہیں اور صرف چٹان سامنے رہ جاتی ہے۔

(سورۃ بقر ۳۶ ۲/۲۶۴)

خلاصہ اور موازنہ

گفتگو بہت طویل ہو گئی۔ اب اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے اور دُنیا کے دوسرے نظاموں اور ازموں سے موازنہ بھی کیجیے۔

(۱) سرمایہ داری کا دشمن اسلام بھی ہے۔ اس کو سرمایہ داری سے انتہائی نفرت ہے، وہ اس کو ختم کرتا ہے اور اسلام کے اصول پر جو نظام قائم ہو اس کا پہلا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کو ختم کر دے مگر وہ سرمایہ داری کے خاتمہ کو پورے نظامِ حیات کا ایک جزء قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ تصور نہیں ہے کہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود اور اسکی کامیابی

صرف سرمایہ داری کے خاتمہ میں منحصر ہے خواہ وہ کسی صورت سے ہو۔

(۲) اسلام کو جس طرح سرمایہ داری سے نفرت ہے اس کو معاشرہ اور سماج کی دوسری برائیوں سے بھی نفرت ہے اسی طرح وہ تخریب اور فتنہ و فساد کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ جس طرح مزدور اور غریب کے حق میں ظلم کو حرام اور ناقابلِ برداشت جرم قرار دیتا ہے اسی طرح ان کے حق میں بھی کسی طرح کا ظلم روا نہیں رکھتا جن کو سرمایہ دار یا دولت مند کہا جاتا ہے۔ وہ ہر ایک کے حق میں عدل اور انصاف کو ضروری قرار دیتا ہے۔

(۳) اور ایسے تمام پروگرام اسلام کی نظر میں ناقابلِ برداشت ہیں جن سے امیر اور غریب یا سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان طبقاتی جنگ یا باہمی نفرت پیدا ہو۔

(۴) وہ انسانیت کے رشتہ کو سامنے رکھ کر سب سے پہلے دولت مند کے ان جذبات کو بیدار کرتا ہے جن کو انسانیت کی خصوصیات قرار دیا جاتا ہے۔ دوسروں کی ضرورت کو محسوس کرنا اور اپنی ضرورت اور کم از کم اپنے مفاد پر دوسرے کی ضرورت کو مقدم رکھنا اس کو "ایثار" کہا جاتا ہے۔ حیات اجتماعی کی فلاح و بہبود اور ترقی کے سلسلہ میں جذبہ "ایثار" بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام سب سے پہلے اس جذبہ کو پیدا کرتا ہے اس کے آداب اور لوازمات کی تعلیم دیتا ہے۔

(۵) انسان کو خود اپنی حقیقت نیز حیات بعد الموت اور فناء و بقاء کے فلسفہ کو ذہن نشین کرا کر سرمایہ دار اور دولت مند کو یقین دلاتا ہے کہ غریب اور ضرورت مند کی امداد خود اس کی اپنی امداد ہے۔

ضرورت مند کی امداد کر کے یا قومی ضرورتوں میں رقم خرچ کر کے اس نے احسان ضرور کیا ہے مگر اس کا نفع دوسروں سے زیادہ خود اس کو پہنچ رہا ہے۔ اگر وہ بخل کر رہا ہے تو خود اپنے حق میں بخل کر رہا ہے۔ قرآن حکیم کی چند آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ غور فرمائیے:

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ (الآیۃ (سورۂ محمدؐ ع ۴)

دیکھو (سنتے ہو) تم کو بُلایا جارہا ہے کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں پھر
تم میں سے کچھ ہیں کہ بخل کرتے ہیں (نہیں دیتے) تو یاد رکھو ـــ جو بخل کررہا ہے،
وہ بخل کررہا ہے خود اپنے آپ سے، اللہ بے نیاز ہے ضرورت مند
اور محتاج خود تم ہی ہو (قومی اور ملّی ضرورتیں خود تمہاری ضرورتیں ہیں
جن کا مفاد خود تمہیں پہنچے گا خدا کو اس کی حاجت نہیں)

(۶) بخل۔ خود غرضی۔ حرص۔ طمع۔ حسد۔ کینہ اور بغض کا تعلق اگرچہ اخلاق سے ہے لیکن نظام اقتصادی اور حیات اجتماعی پر ان کا اثر دُور رس ہوتا ہے اسلام ان سب کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہ علتیں ختم کی جائیں اور ان کی جگہ وسعت نظر۔ فراخ دلی۔ باہمی تعاون نوع انسان کی ہمدردی کے جذبات اسی طرح ابھارے جائیں کہ چور بازاری، رشوت، خیانت وغیرہ کے انسداد کے لیے قانون کی ضرورت نہ ہو بلکہ خود دولت مند اور صاحب اقتدار کے اندر وہ جذبہ پیدا ہو جو افراطِ زر اور ناجائز نفع اندوزی کی امنگ ختم کردے۔
اسلام یہ لائحۂ عمل اختیار کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے۔

(۷) خدا کا تصوّر اور پاداشِ عمل کا یقین اگرچہ کسی سیاسی یا اقتصادی نظام کا جُزو نہیں بن سکتا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اذعان و یقین کی کیفیت درست اور استوار نہ ہو تو قانون کی افادیت بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلام سب سے پہلے نہاں خانۂ دِل کو تصوّرِ خدا سے منور کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ وہ جرائم پیشہ کہلاتے ہیں جو پولیس کے خوف سے جرم نہیں کرتے اور نفاق برتتے ہیں۔ ظاہر و باطن ہر ایک حالت میں جرائم سے وہ بچتا ہے جو خدا سے ڈرتا ہے۔

دِلوں میں خدا کا خوف ہو۔ سیاسی اور اقتصادی نظام کا رشتہ اعلیٰ اخلاق سے مربوط ہو تو وہ سماج وجود میں آسکتا ہے جس کے لیے انسانیت بے تاب ہے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔

اب آپ دُنیا کے دوسرے نظاموں پر نظر ڈالیے جو رائج الوقت ہیں وہاں اخلاق کا کوئی سوال نہیں سماج کی اصلاح شورِ بے ہنگام ہے۔ دِل خوفِ خدا سے خالی۔ تصورِ خدا سے بغاوت، جہاں اینٹی گاڈ۔ خلاف خدا (معاذاللہ) انجمنیں قائم کی جائیں وہاں نتیجہ یہی ہو گا کہ درندگی کا بول بالا ہو گا۔ انسانیت ختم ہو گی اور تقسیم کرنے والے بھیڑیے ہوں گے اگرچہ ان کی صورتیں انسانوں جیسی ہوں گی۔

مالی نظام کے اسلامی اصول

اور

بُنیادی نظریے (مبادیات)

قرآن پاک اور سیرتِ مقدّسہ کا مطالعہ کرنے والا حیران رہ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ سورتیں / آیتیں جو نبوّت کے ابتدائی دَور میں نازل ہوئیں۔ جن سے دعوتِ اسلام کا آغاز ہُوا۔ اُن میں جس طرح توحید، خداپرستی اور نماز کی ہدایت و تلقین کی گئی ہے اور شرک سے نفرت دلائی گئی ہے اُسی طرح قوت و شدّت کے ساتھ اُن میں دولت صرف کرنے کا حُکم ہے۔ طغیان انگیز سرمایہ داری اور بحران پیدا کرنے والی دولتمندی سے نفرت دلائی گئی ہے اور ایسے صَرف و خرچ سے ممانعت کی گئی ہے جس کا مقصد استحصال ہو۔ مثلاً:

(۱) سُورۂ مُزمّل نبوت کے ابتدائی دَور میں نازل ہُوئی۔ اس کا پہلا حصّہ پہلے سال نازل ہُوا (جس میں شب بیداری کی تلقین اور فرعونیت سے (جس کے تحت میں ملوکیت بھی آجاتی ہے) مقابلہ کرنے کی ہدایت ہے؟

دوسرا حصّہ ایک سال بعد نازل ہُوا جو ان احکام پر ختم ہوتا ہے:

نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دیتے رہو۔

(سورہ مزمّل کی آخری آیت)

اس آیت میں خداپرستی کے متعلق صرف ایک حکم ہے: نماز قائم کرو۔

لیکن دولت سے متعلق دو حکم ہیں۔
زکوٰۃ ادا کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو (سورہ ۳، آیت ۲۰)

(۲) اس سے پہلے سورہ علق (اقراء) نازل ہوئی تھی۔ جس کی ابتدائی آیتوں سے "وحی" کا آغاز ہوا ہے اور یہی لمحہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت عطا ہوا تھا۔ اس سورت کا دوسرا حصّہ کچھ عرصہ بعد نازل ہوا۔ دوسرے حصّہ کا پہلا فقرہ یہ ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (الآیۃ)

سچ مچ یہ حقیقت ہے کہ انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے (حد سے نکل جاتا ہے) اس پر کہ دیکھتا ہے کہ وہ مستغنی (صاحبِ دولت) ہو گیا ہے۔

(سورہ نمبر ۹۶ آیات ۶، ۷، ۸)

(۳) سُوْرَۂ مُدَّثِّر سب سے پہلی سورت ہے جس میں آپ کو دعوت و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے پہلے فقرہ میں جس طرح یہ حکم ہے رَبَّکَ فَکَبِّرْ۔
اسی طرح یہ حکم ہے۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرْ۔
کسی پر اس غرض سے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ حاصل کرنا مقصود ہو (کسی کو اس غرض سے نہ دو کہ زیادہ معاوضہ چاہو (بیان القرآن)

سورۃ نمبر ۷۴، آیات ۳، ۶)

سورہ مزمّل کی وہ آیت جس کا ترجمہ (۱) میں پیش کیا گیا، اس میں دولت کے متعلق دو لفظ ہیں:

زکوٰۃ اور قرض

زکوٰۃ ایک مخصوص مقدار ہے جو عموماً سرمایہ کا چالیسواں حصّہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی ختم سال پر لازم ہوتی ہے۔ جب سرمایہ کی ایک خاص مقدار مثلاً چوّن (۵۴) تولہ

چاندی کسی مسلمان کے پاس اس کی ضروریات سے فاضل سال بھر رہی ہو تب اس پر فرض ہوتا ہے کہ اُس کا چالیسواں حصّہ (تقریباً ایک تولہ ساڑھے تین ماشہ) ادا کرے۔

(۴) مکی سورتوں میں سُورہ بلد بھی ہے اس کی چند آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

کیا (انسان) خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں۔
کیا نہیں دیں ہم نے اُس کو دو آنکھیں۔ کیا نہیں دی ہم نے اس کو زبان۔
کیا نہیں دیے ہم نے اُس کو دو ہونٹ جن کے ذریعہ گفتگو اور تقریر و خطابت کا وہ شرف اس کو حاصل ہے جو کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے)
اور کیا نہیں بتا دیے ہم نے اس کو (خیر و شر کامیابی و ناکامی کے) دونوں راستے۔ پس اس نے گھاٹی کا دُشوار گزار راستہ کیوں نہیں طے کیا۔
آپ کو معلوم ہے گھاٹی کیا ہے؟ جس سے گزرنا مشکل ہوتا ہے گھاٹی یہ ہے)
کوئی گردن چھڑانا۔ (غلام خرید کر آزاد کرنا یا مقروض کا قرض ادا کر دینا)
یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی مٹی میں ملنے والے (فرش زمین پر بسر کرنے والے) ضرورت مند کو۔ (سورۃ ۹۰، آیات ۷ تا ۱۶)

یعنی صرف اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے والا اور بولنے والا بنایا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ اس انعام کے شکر میں وہ ہر ضرورت مند کی امداد کرے۔ وہ اس کا عزیز قریب ہو یا اجنبی۔

(۵) سورہ الھمزہ بھی مکہ معظمہ کے اسی دور میں نازل ہوئی۔ یہ پوری سورت سرمایہ داری کے خلاف اس شدت سے گرج رہی ہے کہ انقلاب پسندوں کے تمام لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

تباہی اور بربادی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (اپنی دولت اور سرمایہ کے زعم میں دوسروں کو) طعنہ دیتا ہے، ان میں عیب نکالتا ہے۔ جس نے

سمیٹا مال اور گِن گِن کر رکھا ہے۔ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال سدا رہے
گا اُس کے پاس۔ ہرگز نہیں یقین رکھو ایسی آگ میں ڈالا جائے گا کہ
اس میں جو کچھ پڑے وہ اُس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ آپ کو کچھ معلوم
ہے وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے۔ وہ اللہ کی آگ ہے جو
سلگائی گئی ہے جو دلوں تک پہنچے گی اور اُن پر بند کر دی جائے گی۔
لمبے لمبے ستونوں میں۔ (سورہ الہمزہ ۱۰۴)

سورۂ مزمّل کی آیت جس کا ترجمہ (۱) میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دولت خرچ کرنے
کے متعلق دو لفظ ہیں: زکوٰۃ۔ قرض۔

زکوٰۃ ایک مخصوص مقدار ہے جس کی ادائیگی ختم سال پر عائد ہوتی ہے۔ جب
سرمایہ کی ایک خاص مقدار مثلاً ۵۲ تولہ چاندی جو ضروریات سے فاضل ہو۔ کسی مسلمان
کے پاس سال بھر رہی ہو تو اس پر فرض ہو گا کہ اس چاندی کا چالیسواں حصہ (تقریباً ایک
تولہ ساڑھے تین ماشہ) اس ضرورت مند کو ادا کرے جو مصرف زکوٰۃ ہونے کی شرطیں پوری
کرتا ہو یعنی خود صاحبِ نصاب نہ ہو ایسا رشتہ دار نہ ہو جس کا نفقہ لازم ہوتا ہے۔
غیر مسلم نہ ہو۔ سید نہ ہو (وغیرہ وغیرہ)۔

مگر یہ تفصیل تقریباً ۱۵ سال بعد بتائی گئی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ
سے ہجرت کر کے مدینہ آچکے تھے اور یہاں بھی دو سال تک جب تک یہ تفصیل نہیں بتائی گئی
تھی اس وقت تک زکوٰۃ اور قرض میں صرف اتنا ہی فرق ہو سکتا تھا کہ زکوٰۃ میں یہ ضروری تھا
کہ کسی ضرورت مند کو بلا معاوضہ (بطور ہبہ) کے مالک بنایا جائے اور قرض میں یہ شرط
نہیں تھی۔

مثلاً آزاد کرنے کے لیے غلام خریدا گیا، تو اس کی قیمت میں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی
جا سکتی تھی، کیونکہ یہاں اگرچہ تملیک ہوتی تھی کہ بائع کو رقم کا مالک بنا دیا جاتا تھا، مگر
یہ تملیک بلا معاوضہ نہیں ہوتی تھی یا مثلاً حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ

میں ایک کنواں (جو ایک یہودی کی ذاتی جائداد میں تھا) خرید کر وقف کر دیا، تو اگرچہ اس سے مسلمانوں کی ایک بنیادی ضرورت پوری ہو گئی کہ یہودی بغیر معاوضہ لیے پانی بھرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور اب یہ کنواں وقف عام ہو گیا، تو ہر شخص کو بلا روک ٹوک اور بلا معاوضہ جتنی ضرورت ہوتی پانی لینے کی عام اجازت ہو گئی تھی، مگر چونکہ کسی مسلمان کو اس کا مالک بنانا مقصود نہیں تھا، لہٰذا اس میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جا سکتی تھی؛ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے علاوہ اپنے پاس سے رقم خرچ کی جو قرض بنام خدا ہوئی۔

پس نزولِ آیت کے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے آیت کا مفاد وہ ہوا جو قرآن شریف میں دوسرے موقع پر ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

یَسْـَٔلُوْنَكَ - تا - اَلْعَفْوَ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۱۸)

"آپ سے دریافت کرتے ہیں۔ کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیں۔ جو کچھ فاضل ہو وہ خرچ کر دو۔"

پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں جو افزود ہو۔ (شاہ عبدالقادر صاحبؒ)

سورہ بقرہ کی یہ آیت اگرچہ بعد میں نازل ہوئی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی مکّی زندگی کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں برابر عمل وہی رہا ہے جو مفہوم آیت ہے۔ بعض حضرات مفسرین کی رائے یہ ہے کہ سورۂ مزمّل کی یہ آیت جس میں اداءِ زکوٰۃ کا حکم ہے مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، مگر یہ غیر ضروری تکلف ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے بموجب یہ آیت مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوئی۔ مدینہ طیبہ میں زکوٰۃ کے متعلق مذکورہ بالا تفصیل بتائی گئی۔ (فیض الباری)

پوری سورت کا سلسلہ کلام (سباق) بھی یہی واضح کرتا ہے، کیونکہ سورت کی پہلی آیتوں میں جو شب بیداری کا حکم دیا گیا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاءِ کرام نے (جو اس وقت شرف رفاقت حاصل کر چکے تھے) اس حکم پر اس طرح عمل کیا کہ کم از کم

ایک تہائی، ورنہ نصف شب یا دو تہائی رات یادِ خدا میں کھڑے ہو کر گزاری جس سے پیروں پر ورم آ گیا اور سال بھر یہ مجاہدہ کرتے رہے، تب اس سورت کا دوسرا حصّہ نازل ہُوا، جس میں قیامِ شب کے حکم میں تخفیف کی گئی اور حکم ہُوا کہ سہولت کے بموجب قرآن پڑھو اور تخفیف کی وجہ ایسے انداز سے بیان کی گئی کہ مستقبل کا پورا نقشہ سامنے آ گیا۔ "بیماری کے عوارض بھی پیش آئیں گے ـــ قومی، ملّی اور معاشی ضرورتوں کے لیے سفر بھی کرنے ہوں گے۔ راہِ خدا میں جہاد بھی کرنا ہو گا۔ اسی آیت کا آخری حصّہ یہ ہے کہ جس میں نماز، ادائے زکوٰۃ اور قرض فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔

پس جس طرح اس توجیہہ میں ایک خانہ قتال اور جہاد کا ہے جس کی تفصیل دس بارہ سال بعد سامنے آئی ایسے ہی زکوٰۃ کا خانہ بھی ہے جس کا تصوّر اب دلا دیا گیا اور تفصیلات بعد میں نازل ہُوئیں، لہٰذا یہ بات کہ اس وقت یہ آیت نازل نہیں ہُوئی چودہ پندرہ سال بعد مدینہ میں نازل ہُوئی تکلف بارد ہے۔ اتفاق سے یہ پُورا رکوع ایک آیت ہے، اس لیے بھی یہ تجزیہ مناسب نہیں ہے کہ کچھ کو مکّی مانا جائے اور کچھ کو مدنی (واللہ اعلم بالصواب)

(۶) اسی دَور کا واقعہ ہے جس کی شہادت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ دیا کرتے تھے کہ ایک روز حرم کعبہ میں گئے، تو دیکھا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم دیوارِ کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما ہیں۔ ان کو آتے دیکھا، تو فرمایا:

هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"ربِ کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ سب سے زیادہ خسارہ میں رہیں گے۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مَیں نے یہ ارشاد سُنا تو لرز گیا۔ مجھے خوف ہُوا کہ شاید میرے بارے میں کچھ نازل ہُوا۔ مَیں نے عرض کیا۔ آپ پر میرے ماں باپ قُربان، کن کے متعلق یہ ارشاد ہو رہا ہے۔ فرمایا، وہی جن کے پاس دولت زیادہ ہے۔ پھر ہاتھ پھیلا کر دائیں بائیں ہاتھ بڑھاتے ہُوئے فرمایا۔ اس خسارے سے صرف وہ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں جو اس طرح (دونوں ہاتھ بڑھا کر) اپنے سامنے دیتے ہیں۔ دائیں دیتے رہیں۔

بائیں دیتے رہیں۔ (ترمذی شریف)

(۷) سیدنا ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمیں صدقہ (کسی ضرورت میں چندہ کے لیے) فرمایا کرتے تو ہم بازار میں جاکر پلّہ ڈھوتے (بوجھ اُٹھانے کی مزدوری کرتے تھے) اور ایک "مد" (تقریباً سیر بھر غلہ یا کھجور) حاصل کرلیتے تھے (اور لاکر پیش کردیا کرتے) (بخاری شریف[190])

اگرچہ یہ عمل مدینہ میں ہوا کرتا تھا مگر اس سے مکہ معظمہ کی زندگی اور وہاں کے طرزِ تعاون پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم کی آیتیں سابقین اولین کی ثناخواں ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ بعد کے حضرات اگرچہ اُحد کے برابر بھی خرچ کردیں تو ان سابقین کے ایک "مد" کے مساوی نہیں ہوسکتا۔

عبادت اور پوجا کے دو سلسلے ہیں ایک وہ جس کی بنیاد توحید ہے۔ دوسرا وہ جس کی بنیاد شرک ہے۔

اسلام توحید کا حامی۔ داعی اور معلّم ہے اور جن عبادتوں کی وہ تعلیم دیتا ہے ان سب کی بنیاد توحید پر رکھتا ہے۔

اسی طرح مالی نظام کے دو سلسلے ہیں۔ ایک وہ جس کی بنیاد داد و دہش، جود و عطا اور انفاق (یعنی اپنے سرمایہ کو خرچ کرنے) پر ہے۔ دوسرا وہ جس کی بنیاد اخذ و ستد، وصول کرنے، دولت سمیٹنے، استحصال اور زیادہ ستانی پر ہے۔

اسلام جس طرح توحید کا حامی، داعی اور مبلغ ہے، اسی طرح وہ اس مالی نظام کا حامی ہے جس کی بنیاد داد و دہش، استغناء، سیر چشمی اور فائدہ رسانی پر ہو۔

وہ مالی نظام کے مذکورہ بالا دوسرے سلسلہ کا اتنا ہی مخالف ہے اور اسی طرح اس کی جڑیں اکھاڑتا ہے جیسے وہ شرک، کفر، الحاد اور بے دینی کا مخالف ہے اور ان کے مقابلہ کے لیے اپنے تمام ذرائع صرف کرتا ہے۔

نبوت کے ابتدائی دور میں جب تفصیلی احکام کی تلقین نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے صرف اشارات دیئے جا رہے تھے۔ ان دونوں بنیادوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ روم میں اسلام کی پالیسی کا اظہار جن الفاظ میں کر دیا تھا ان کا ترجمہ یہ ہے:

ادا کر قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین کو اور مسافر کو (ملکی ہو یا غیر ملکی کوئی تفریق نہیں ہے) یہ بہتر ہے ان کے لیے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں ایسے ہی لوگ ہیں فلاح پانے والے (کامیاب) اور وہ جو تم سود دو تاکہ لوگوں کے مال میں بڑھوتی (اضافہ) ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا (البتہ) جو زکوٰۃ ادا کرو جس سے اللہ کی رضا مقصود ہو تو یہ (زکوٰۃ ادا کرنے والے) ہی ہیں وہ اضافہ کرنے والے (بڑھانے والے)

(سورہ روم نمبر ۳۰، آیت ۳۸، ۳۹)

مدینہ طیبہ میں جب تفصیلات بتائی گئیں تو ان دونوں سلسلوں کا مقابلہ نمایاں کر دیا گیا۔ اور ہر ایک کی تاثیر کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا۔ ایک سلسلہ یہ ہے:

(۱) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات اور دن پوشیدہ طور پر اور کھلے طور پر تو یقیناً ان کے پروردگار کے یہاں ان کا اجر ہے نہ ان کو (عذاب) کا ڈر ہوگا اور نہ (نامرادی کی) غم گینی۔

(سورہ بقرہ آیت ۲۷۳، رکوع ۳۹)

(۲) جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے کام بھی اچھے ہیں۔ نیز تمام آداب کا لحاظ کرتے ہوئے نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں تو بلاشبہ ان کے پروردگار کی بارگاہ میں ان کا اجر ہے اور نہ ان کو کسی طرح کا ڈر ہو سکتا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۷۶، ع ۳۹)

(۳) سورۂ روم کی مذکورہ بالا آیت میں جو فرمایا گیا تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے

ہی اضافہ کرنے والے ہیں تو اس اضافہ اور بڑھوتی کی شکل بھی بیان کر دی گئی کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بیج کا دانہ بویا گیا تو صرف ایک دانہ تھا۔ پھر ایک دانہ سے سات بالیں پیدا ہو گئیں اور ہر دانہ میں ۱۰۰ دانے نکل آئے اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی دوگنا کر دیتا ہے۔

(سورہ بقرہ، آیت ۲۶، ع ۳۵)

دوسرا سلسلہ یہ ہے:

(۱) جو لوگ کھاتے ہیں سُود تو نہ اُٹھیں گے، مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ جس کے حواس کھو دیے جن نے لپٹ کر (سورہ بقرہ ع ۳۹) (یعنی جیسے کوئی آسیب زدہ ہو یا مرگی کا مریض)

(۲) اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو رہ گیا سود (جو حرمت سود سے پہلے لازم ہو چکا تھا) اگر تم فی الحقیقت خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر اس باغیانہ روش سے توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لیے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو اور سُود چھوڑ دو نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے اور اگر مقروض تنگدست ہے تو چاہیے کہ اسے فراخی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے۔

(سورہ بقرہ ع ۳۸، آیت ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰)

فیصلہ (ڈگری)

دارالاسلام وہی ہے جہاں اسلام کا قانون رائج ہو۔ ایسی مملکت، کوئی عدالت سود کی ڈگری نہیں دے سکتی۔ اگر دارالاسلام میں کسی نے سود لے لیا اور سود دینے والے نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا تو اسلامی عدالت سود کی رقم واپس کرا دے گی۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

دارالاسلام کا کوئی مسلمان کسی غیر اسلامی مملکت میں پہنچا اور وہاں اس نے وہاں کے رہنے والے کسی غیر مسلم سے سود لے لیا تو اسلام جس اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس کے لحاظ سے یہ بھی غیر مناسب ہے تاہم قانونی بات یہ ہے کہ اگر وہ غیر مسلم دارالاسلام میں آکر اس سود لینے والے مسلمان پر دعویٰ کرے تو اسلامی عدالت اس کو سود واپس کر دینے کا فیصلہ نہیں کرے گی، کیونکہ وہ ایسی مملکت کا معاملہ ہے جو اس کے دائرۂ اقتدار سے خارج ہے جہاں اسلامی قانون رائج نہیں ہے۔

آج پوری دنیا سودی نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور بینک سسٹم پر ناز کر رہی ہے، مگر کیا دنیا کی تمام طاقتیں خصوصاً بڑی طاقتیں خود غرضی، سنگ دلی اور حرص و طمع کے آسیب میں مبتلا نہیں ہیں اور کیا خوف و ہراس، بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی وبا تمام دنیا میں پھیلی ہوئی نہیں ہے؟ خود غرضی اور سنگ دلی کا جواز پیدا کرتی ہے اور جب سود ملتا ہے تو ان خصلتوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور جب یہ خصلتیں قوم کا مزاج بن جاتی ہیں تو وہ بحران رونما ہوتا ہے جو آج دنیا پر طاری ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہلک آلات ایجاد ہو رہے ہیں جو بڑی سے بڑی قوموں کو بدحواس کیے ہوئے ہیں۔ انتہا یہ کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ آتش فشاں پر بیٹھا ہوا ہے۔

نوعِ انسانی کے لیے اس سے زیادہ آسیب کیا ہو سکتا ہے اور کیا اس مشاہدہ کے بعد بھی ارشادِ ربّانی کی تصدیق کے لیے کسی اور مشاہدہ کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں سودی قرض

سودی نظام ہندوستان میں بھی پر پھیلائے ہوئے ہے اسی نظام کے ماتحت

ترقیاتی منصوبے جاری کیے جا رہے ہیں۔ ان منصوبوں کے لیے جو قرض لیا گیا ہے اس کا سُود مسلمانوں کو بھی ادا کرنا پڑ رہا ہے بلا شبہ مسلمانوں کو ہر سُودی کاروبار سے الگ رہنا چاہیے، مگر جب وہ اپنی مرضی اور اپنے اختیار کے بغیر اس میں جکڑے ہوئے ہیں تو لامحالہ اس حد تک جائز سمجھا جاتا ہے کہ اداءِ سُود کا یک طرفہ نقصان ان کو مسلسل نہ پہنچتا رہے اور اس عمومی نقصان کی تلافی ہو سکے۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹیاں وہ قائم کر سکتے ہیں اور ان میں شرکت بھی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت سے سُودی قرض لے سکتے ہیں، بہر حال احتیاط یہی ہے کہ دامن پاک رکھا جائے۔

خذ ما صفا ودع ما کدر

اللہ کے لیے قرض اور قومی قرضہ

یا

قرضۂ جنگ

حکومتیں ترقیاتی منصوبوں اور دفاعی ضرورتوں کے لیے قوم سے قرض لیتی ہیں۔ کیا عجب ہے قرض کی اصطلاح انہوں نے قرآنِ حکیم سے سیکھی ہو، اگرچہ اس اصطلاح پر جس طرح عمل کیا جاتا ہے وہ منشاءِ قرآنی کے سراسر خلاف ہے کیونکہ وہ قرض کے مقصد اور معنی کو مسخ کر دیتا ہے۔

قرآنِ پاک جس کو قرض کہتا ہے اس کا اثر یہ تو ہو سکتا ہے کہ دولت مند کی اُبھری ہُوئی سطح پست ہو جائے، کیونکہ اس قرض میں کبھی پُوری دولت کا بھی مطالبہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ افزود ہے سب خرچ کرد۔

(سورہ بقرہ، آیت ۲۱۸)

لیکن یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ غریب کی غربت بڑھ جائے اور پسماندہ طبقہ اور پست ہو جائے۔ ان کے برعکس رائج وقت سرکاری قرضوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ امیر، زیادہ امیر اور غریب، زیادہ غریب ہو جاتا ہے اور امیری اور غریبی کے درمیان کا فاصلہ اگر پہلے دس گز تھا تو اب پندرہ گز ہو جاتا ہے، کیونکہ حکومت کا قرض سُود سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ سُود مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر عوام سے وصول کیا جاتا ہے اور قرض دینے والوں

کو ادا کیا جاتا ہے۔ غریب جو ٹیکس ادا کرتا ہے اس کے عوض میں اس کو کچھ نہیں ملتا، لیکن دولت مند کے ٹیکس کی تلافی اس سُود سے ہو جاتی ہے جو اس کے دیئے ہُوئے روپیہ پر ملتا ہے جس کی وجہ سے اس کی دولت صرف محفوظ ہی نہیں رہتی، بلکہ کچھ لے کر صحیح سالم واپس ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو جاتا ہے۔ یہی سُود کی خاصیت ہے کہ امیر کو زیادہ امیر کر دیتا ہے اور غریب کو پیس ڈالتا ہے۔

آمدنی کے عام مدات یعنی زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ سے (جن کی تفصیل آئندہ آئے گی) جب قومی اور ملکی ضرورتیں پوری نہ ہوں تب رب العالمین قرض کی اپیل کرتا ہے، لیکن اس وعدہ کے ساتھ کہ اس کا منافع اللہ تعالیٰ ادا کرے گا۔ عوام سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ عوام کو فائدہ پہنچانے کے لیے قرض لیا جا رہا ہے۔ نہ اُن پر بار ڈالنے کے لیے سورہ بقر میں ہے:

"اللہ کی راہ میں لڑائی پیش آجائے تو (موت سے نڈر ہو کر) جنگ کرو۔ اللہ تعالیٰ سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔" (آیت ۲۴۴)

اپیل: کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ اللہ تعالیٰ بڑھائے اس قرض کو اس کے لیے کئی گُنا۔ (آیت ۲۴۵)

صاحبِ دولت کی دولت (خدا کے نام پر) خزانہ سے نکل کر گردش کرے گی تو ظاہر ہے دولت مند کو اس دولت میں سے دُنیا میں کچھ نہیں ملے گا، البتہ اس گردش سے عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ ان کی اقتصادی سطح کچھ بلند ہو جائے گی اور اس طرح امیری اور غریبی کی درمیانی مسافت اعتدال پر آجائے گی۔

جنگ اور دفاع کے علاوہ دوسری قومی ضرورتوں کے لیے بھی یہ قرض لیا جائے گا (مثال کے لیے ذیل کا واقعہ مطالعہ فرمائیے):

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ قبیلہ مضر کا ایک گروہ پہنچا (شکستہ حال)

برہنہ پا، برہنہ بدن، کچھ کمبل لپیٹے ہُوئے، کچھ عبا پہنے ہُوئے، کمروں میں رسّیاں بندھی ہُوئیں جن سے کمبل کے کنارے یا عبا کے دامن تھمے ہُوئے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی یہ حالت دیکھی تو چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا۔ آپ اندر تشریف لے گئے پھر باہر آئے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اذان پڑھیں۔ اوّل جماعت ہُوئی، پھر آپ نے خطبہ دیا۔ پہلے سورۂ نساء کی ایک آیت پڑھی جو اس سورت کی پہلی آیت ہے:

"اے لوگو ڈرو اس خدا سے جس نے تم کو ایک انسان (آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا۔ اس جان واحد سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دو سے بے شمار مَرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ (پس دیکھو) اللہ سے ڈرو جس کے نام پر آپس میں ایک دوسرے سے (محبت اور حُسنِ معاملہ کا) مطالبہ کیا کرتے ہو۔ نیز رشتہ داری اور قرابت کے معاملہ میں تقویٰ سے کام لو اللہ تعالیٰ (تمہارے اعمال کا) نگرانِ حال ہے۔ (آیت ۱، سورۂ نساء ۴، ع ۱)

پھر سورۂ حشر کے آخری رکوع کی ابتدائی آیتیں پڑھیں:

"اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہیے کہ دیکھ لے ہر شخص کہ اس نے کیا بھیجا کل کے واسطے"

پھر آپ نے فرمایا:

دینار، درہم، کپڑا، صاع بھر گیہوں، صاع بھر کھجور جس کے پاس جو ہو صدقہ کر دے (راہِ خدا میں دے دے) کچھ نہ ہو کھجور کا ایک ٹکڑا ہو وہی دے دے۔

حاضرین نے ارشادِ گرامی سُنا۔ اور جو کچھ کسی کے پاس تھا لانا شروع کر دیا (سب سے پہلے) ایک انصاری ایک بوری لے آئے جو اتنی وزنی تھی کہ وہ اس کے اُٹھانے سے عاجز ہُوئے جا رہے تھے۔ پھر

بھر لگ گیا۔ یہاں تک کہ غلہ اور کپڑوں کے دو ڈھیر کھڑے ہو گئے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمکنے لگا۔
(مسلم شریف الحث علی الصدقہ ص۳۲۶، جلد ۱)

اسی جیسے موقع پر آپ نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا:

اتقوا النار ولو بشق تمرۃ (مسلم شریف ص۳۲۷، ج ۱ بخاری شریف وغیرہ)
آگ سے بچو۔ اگر کچھ نہ ہو۔ کھجور کا ایک ریزہ ہی دے کر تحفظ حاصل کرو۔

یعنی ایسے موقع پر جب کہ فاقہ کی حالت سامنے ہو جو کچھ ممکن ہو اس کا خرچ کر ڈالنا واجب ہے۔ اگر خرچ نہ کیا تو عند اللہ عذاب کا مستحق ہو گا۔ قرآنِ حکیم ایسے صرف کو اللہ تعالیٰ کے ذمہ قرض تسلیم کرتا ہے اس قرض سے عوام کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ ان کی سطح بلند ہو رہی ہے اور اہلِ ثروت کا اخلاقی فرض ادا ہو رہا ہے۔ خود غرضی اور سنگ دلی کے بجائے آپس میں محبت۔ ہمدردی اور احترام کے جذبات بڑھ رہے ہیں۔ یہ "نعمت کبریٰ" ہے جس کی رہنمائی قرآن حکیم کر رہا ہے۔

ملکیت کی حقیقت اور حقیقی مالک

ملکیت

مسئلہ ملکیت ان ذہنوں میں اُلجھا ہُوا ہے جو خدا شناسی کی روشنی سے محروم ہیں جو صاحب عقل و بصیرت خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں جن کو یقین ہے کہ پوری کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ مالک وہی ہے جو خالق ہے جو رب ہے۔ جو پروردگار ہے۔

اگر شیئر ہولڈرز اور کمپنی کے حصہ داروں کو اس لیے مالک مانا جاتا ہے کہ انھوں نے رقم لگائی ہے۔ میٹریل فراہم کیا، مزدوروں کی مزدوری ادا کی یا مزدوروں کی ملکیت کا دعویٰ اس لیے کیا جاتا ہے کہ محنت، پیداوار کی اصل ہے۔ انھوں نے محنت کر کے جو مال تیار کیا، جو مال تیار کرنے والا ہے وہی مالک ہونا چاہیے تو ان دلائل کی بنیاد پر حقیقی مالک اس کو کیوں نہیں مانا جائے گا جس نے مال تیار کرنے والے کو تیار کیا۔ جس نے میٹریل پیدا کیا۔ جو سرمایہ دار اور مزدور دونوں کا خالق ہے۔ جس نے سرمایہ دار کو سرمایہ بخشا تو مزدور کو وہ قوت عطا فرمائی جس سے وہ مزدوری کرتا ہے اس کے ہاتھ پیر اور وہ تمام اعضاء بنائے جن سے وہ کام لیتا ہے۔

توحید

یہ ہے کہ جس طرح پوری کائنات اور کائنات کی ہر شئے کا خالق خدا کو مانا جائے

ایسے ہی ہر شے کا مالک بھی اسی کو مانا جائے۔ یہ صرف اسی کی عطا ہے کہ اس نے ہمیں نیست سے ہست کیا۔ یعنی نیست کو جامہ وجود پہنایا۔ یہ صرف اسی کا کرم ہے کہ کائنات کی ہستیاں ہمارے لیے مخصوص کر دیں۔ ہمیں ان پر اقتدار بخشا اور ان کے استعمال کا حق عطا فرمایا۔ قرآن پاک اسی فلسفہ کو ذہنوں میں پیوست کرتا ہے اور صاحبِ ایمان کا ذہن اسی فلسفہ کو حق سمجھتا ہے۔ ان حقائق کا کون انکار کر سکتا ہے جن کی طرف قرآنِ پاک نے تقریباً ڈیڑھ سو آیتوں میں اشارہ فرمایا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (سورہ الزمر ع ۶)۔

اللہ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا (سورت ۳۹، آیت ۶۲ و سورت انعام آیت ۱۰۲)

خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ (الانعام ع ۱۲) ہر چیز کو پیدا کیا۔ (سورت ۶، آیت ۱۰۱)

هل من خالق غیر اللہ (سورۃ فاطر ع ۱) کیا کوئی پیدا کرنے والا ہے اللہ کے سوا (سورہ ۳۵، آیت ۳)

فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (سورۂ لقمان ع ۱)

بس مجھے دکھاؤ وہ کیا ہے جس کو اللہ کے علاوہ دوسروں نے پیدا کیا (سورہ ۳۱، آیت ۱۱)

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (سورۂ صافات ع ۳)

اللہ نے بنایا تم کو اور ان چیزوں کو جن کو تم بناتے ہو۔ (سورت ۳۷، آیت ۹۶)

جب وہ انسان کا خالق اس کی معمولات و مصنوعات کا خالق۔ انسان کے علاوہ کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے تو لامحالہ ہر چیز کا مالک بھی ہے۔ جو چیز بھی ہے وہ اسی کی ہے اور صرف اسی کی ہے۔

لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (سورہ بقرہ ع ۴۰)

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

(سورۃ بقرہ ع ۴، آیت ۲۸۴)

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (المنافقون ع ۱)

اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے (سورۃ ۶۳، آیت ۷)

یہ اس کا احسان وکرم ہے کہ اس نے حضرت انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور عالم مشاہدہ کی ہر چیز اس کے کام میں لگا دی۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔

(سورہ جاثیہ، ع ۲)

جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگا دیا۔ (سورہ ۴۵، آیت ۱۳)

جب زمین و آسمان کی ہر چیز اس لاڈلے خلیفہ (انسان) کے کام میں لگا دی گئی تو اس خلیفہ کو حق ہو گیا کہ وہ اپنے طور پر بھی کسی چیز کو کام میں لا سکتا ہے تو کام میں لے آئے۔ یعنی زمین و آسمان کی جس چیز کو مسخر کر سکتا ہے، جس چیز پر وہ قابو پا سکتا ہے اس کو اپنے قابو میں کر لے، یہ چیز اس کی ہو جائے گی۔ مالک حقیقی نے عام اجازت دے رکھی ہے۔

"جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

یہ ہے انسانی ملکیت کی بنیادی حقیقت۔ چنانچہ بنی نوع انسان، یعنی اقوام عالم کا مسلّمہ دستور بھی یہی ہے کہ مالک وہ ہے جو سب سے پہلے پہنچے اور اپنے قابو میں لے آئے۔ سب سے پہلا قبضہ ملکیت مانا جاتا ہے۔

زمین کے کسی خطّہ کی مالک وہ قوم ہے جس نے سب سے پہلے اس پر قبضہ کیا۔ پہاڑ کی کسی چوٹی پر جس نے پہلے قابو پا لیا وہ اس کی ہو گئی۔ سمندر پر حضرت انسان نے قابو پا لیا وہ انسان کا ہو گیا۔ فضا پر قابو پا لیا وہ اس کی ہو گئی، جو قوم چاند پر سب سے پہلے قابو پا لے گی وہ اس کی مالک ہو جائے گی، جو مریخ یا سورج پر سب سے پہلے قابو پا لے گی وہ اس کی مالک ہو جائے گی ــــ یہ قومی ملکیت کی صورت ہے۔ افراد کے لئے بھی یہی صورت ہے قدرت کی تمام چیزیں انسان کے لیے مباح ہیں۔ سمندر

کی مچھلیاں، فضا کے پرندے، جنگلوں کے جانور انسان کے لیے مباح ہیں۔ سمندر سے موتی جو پہلے نکال لے گا وہ اس کا ہے۔ نافہ مشک، لعل بدخشاں اور کوئی بھی ہیرا، قیمتی سے قیمتی پتھر جو اب تک قدرت کی تحویل میں تھا جو انسان پہلے اس پر قبضہ کر لے گا وہ اس کا ہو جائے گا۔

مگر قبضہ کے کیا معنی؟ صرف یہ کہ بلا شرکت غیرے اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ نفع کے سلسلہ میں تبادلہ بھی ایک نفع ہے۔ غوطہ زن نے سمندر سے موتی نکالا اور کوہ کن نے پہاڑ کی چٹان پھاڑ کر کوئی لعل برآمد کیا۔ ان دونوں کو حق ہے کہ آپس میں تبادلہ کر لیں۔ اس کا نام خرید فروخت اور انتقالِ ملکیت ہے، مگر حقیقی ملکیت کس کی ہے اور حقیقی مالک کون ہے۔ ظاہر ہے حقیقی مالک وہ ہے جس نے پیدا کیا، بنایا، بڑھایا، جس نے ابر نیساں کی ایک بوند کو سیپ میں بند کر کے پالا اور پرورش کیا۔ یہاں تک کہ وہ قطرہ باراں آبدار قیمتی موتی ہو گیا۔ انسان کی ملکیت یہ ہے کہ اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہے، اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، کسی دوسرے انسان کو روکنے کا حق نہیں پہنچتا۔ علماء اسلام نے ملکیت کی تعریف میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

علامہ الامام قرافی۔ متوفی ۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء کے الفاظ یہ ہیں:

الملك اباحة شرعية فى عين اومنفعة تقتضى تمكن صاحبها من الانتفاع بتلك العين اوالمنفعة اواخذ العوض عنهما من حيث هى كذالك (انوار البرق فى انواع الفروق، مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۴۴ بحوالہ الملكية فى الاسلام للسيد ابى نصر احمد الحسينى)

"ملک شریعت کی طرف سے کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو یہ اجازت حاصل

ہے، خاص اس چیز سے یا اس کی منفعت سے نفع حاصل کرے یا اسی حیثیت میں کہ شریعت نے اجازت دی ہو، اس چیز کا یا اس کے منفعت کا بدل لے لے۔"

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) عبید اللہ بن مسعود الحنفی المتوفی ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء صاحب شرح الوقایہ عرف "صدر الشریعۃ الثانی" نے یہ تعریف کی:

هو اتصال شرعي بين الانسان وبين شئ يكون مطلقاً لتصرفه فيه وحاجزاً عن تصرف الغير فيه۔

(شرح الوقایہ کتاب العتاق)

"ملک، انسان اور کسی چیز کے درمیان شریعت کا تجویز کردہ ایسا تعلق ہے جو اس شخص کے لیے جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اس شئے میں تصرف کرے اور دوسرے کے تصرف کو روکتا ہے۔"

شارح ہدایہ، علامہ کمال بن الہمام متوفی ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء کی تعبیر یہ ہے:

الملك قدرة يثبتها الشارع ابتداءً على التصرف الا لمانع

(بحوالہ الاشباہ والنظائر ص۵۳۱) (القول فی الملک الفن الثالث)

"ملک، تصرف کرنے کی وہ قدرت ہے جو شریعت نے بلاواسطہ ثابت کی ہو بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ یعنی ایسی قدرت کہ اگر کوئی شرعی (قانونی) رکاوٹ نہ ہو تو ہر طرح کا تصرّف کر سکتا ہے۔ (تصرف کی طاقت وکیل کو بھی ہوتی ہے، مگر بلاواسطہ نہیں ہوتی بلکہ موکل کی عطا کردہ ہوتی ہے، لہٰذا وکیل کو مالک نہیں کہا جائے گا۔"

ایک دیوالیہ جس کو عدالت نے نوٹس دے دیا کہ وہ کوئی چیز بیچ نہیں سکتا۔ وہ اگرچہ تصرف نہیں کر سکتا مگر وہ اپنے اثاثہ کا مالک ہے۔ ہندوستان کے مشہور مایۂ ناز فیلسوف اسلام حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کے الفاظ نہایت

مختصر اور واضح ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"معنى الملك فى حق الآدمى كونه احق بالانتفاع من غيره"

(حجۃ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق، ج ۲ ص ۹۶)

"آدمی کے حق میں ملک کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اس کو نفع اُٹھانے کا حق زیادہ ہے۔"

بہرحال جب کہ ملکیت انسان کی حقیقت صرف یہ نکلی کہ اس نے ایسا قابو پالیا یا اس کو ایسی قدرت میسّر آگئی جس سے اس کو نفع حاصل کرنے کا حق ہو گیا تو ایمان داری یہ ہے کہ اس مقبوضہ کو انسان امانت یا عاریت سمجھے اس کے اصل مالک کو پہچانے اور اپنے تصرف اور انتفاع کو مالکِ حقیقی کی ہدایات کے ماتحت رکھے۔ جن حقیقت شناس خدارسیدہ بزرگوں نے قرآن اور مذہب کی روشنی میں اسلام اور احکامِ اسلام کے فلسفہ کو سمجھا پھر اس کو فارسی زبان کے شیشہ میں ڈھالا۔ ان میں سے ایک شعر ہے ؎

در حقیقت مالکِ ہر شئے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزد ما است

یہ شعر مسلمانوں کے عقیدہ کے عین مطابق ہے، اس لیے ہر با ذوق مسلمان کی زبان پر ہوتا ہے اور وہ جب اپنی اور ان چیزوں کی حقیقت پر غور کرتا ہے جن کو وہ اپنی سمجھتا ہے تو خاص جذبہ اور کیف کے ساتھ اس شعر کو گنگناتا رہتا ہے۔

انفرادی مِلک کی ضرورت

امانت یا عاریت کو مِلک کی حیثیت کیوں دیجاتی ہے

گائے بیل وغیرہ جتنے بھی جانور ہیں ان کے سامنے صرف پیٹ بھرنے یعنی بقاءِ حیات کا مسئلہ ہے، قدرت ان کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ جانور قدرتی ذخیروں سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔ یہاں ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انسان کے سامنے بھی صرف بقاءِ حیات کا مسئلہ ہوتا تو قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ انسان کے حق میں مِلک۔ ملک کی حیثیت اور اس کی ضرورت پر بحث کی جاتی، لیکن انسان کے سامنے پیٹ سے پہلے خود انسانیت کا مسئلہ ہے۔ انسان ہے تو لامحالہ اس میں انسانیت ہونی چاہیے۔ انسانیت کیا ہے انسانیت کیسے پیدا کی جائے۔ ان مسائل کو اگر پیٹ کے مسئلہ سے مقدم نہ رکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق نہ رہے۔

مسئلہ انسانیت اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک قدرت کی پیدا کردہ چیزوں پر قدرت کی طرف سے افراد انسان کیلئے ایسے تصرفات کا حق تسلیم کیا جائے جن کو مالکانہ تصرفات اور مالکانہ اختیارات کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان سماج چاہتا ہے اور سماج یا معاشرہ ہی ایسی خصوصیت ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور تعمیر و تمدن اور ترقی کی بنیاد بنتی ہے۔ انسانیت ایسی خصوصیتوں اور خصلتوں کا نام ہے جن سے معاشرہ اور سماج میں خوبی اور عمدگی پیدا ہو جن کے ذریعہ ایک انسان بہترین سماج کا معمار بن سکے، ورنہ کم از کم کسی باعزت اور شریف سوسائٹی کا

رُکن بن سکے۔

معاشرہ اور سماج کے لیے باہمی رابطہ، تعاون اور امن بنیادی شرط ہے۔ ان شرطوں کے بغیر سماج کا وجود ہی نہیں ہو سکتا اور اگر بالفرض وجود ہو جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اچھا سماج وہ ہے جس کے افراد باہمی رابطہ انسیت اور محبت کے رشتہ میں جکڑا ہُوا ہو۔ ہمدردی کی پسیچ اس رشتہ کے اندر سرایت کیے ہُوئے ہو، رحم اور شفقت کے پودے لگے ہُوئے ہوں جو بڑھ چڑھ کر سماج کو انسانیت اور شرافت کا گلشن بنا رہے ہوں۔

اسبابِ محبّت

محبت روحانی تعلیم سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ماں باپ کی محبّت فطری ہوتی ہے لیکن سماج اور معاشرہ کا ہر ایک فرد دوسرے کا ماں باپ نہیں ہوتا اس میں برابر کے بھائی بہن بھی ہوتے ہیں اور ایسے اجنبی بھی ہوتے ہیں جن سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یا اگر ہوتا ہے تو بہت دُور کا۔ روحانی تربیت بھی ہر ایک کا حصّہ نہیں ہے۔ حُسن کا چرچا بہت ہے جس کے لیے عشق و محبت کا سرمایا لٹایا جاتا ہے، مگر اس پر متاعِ جان قربان کرنے والے بہت کم ہیں۔ حضرات شعراء کو دنیائے شعر میں صرف ایک ہی مجنوں مِلا ہے مگر اس کا بھی حسب نسب معلوم نہیں اور نہ یہ معلوم کہ کس ملک کا رہنے والا تھا۔ لفظ مجنوں عربی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحرائے عرب کا ہو گا۔

بہرحال مخصوص صورتوں میں اور نادر مثالوں کو چھوڑ کر عام بات یہی ہے کہ محبت اور انسیت ثمرہ ہوتا ہے احسان کا۔ نتیجہ ہوتا ہے لطف و کرم کا۔ ایثار اور قربانی کا۔ داد و دہش اور سخاوت کے پودوں پر محبت کے پھُول کِھلا کرتے ہیں۔ ہدیہ اور تحفہ کی ڈالیوں پر عنایت و شفقت کے غنچے چٹخا کرتے ہیں، لیکن یہ اسباب محبت جب

ہی وجود میں آسکتے ہیں اور معاشرہ دسماج وجود پذیر ہو کر بہتر جب ہی بن سکتا ہے جب افراد کو مالکانہ اختیارات حاصل ہوں۔ اور جن چیزوں کو قدرت کی امانت کہا گیا ہے وہ ان افراد کے لیے مملوک کی حیثیت رکھیں سخاوت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے پاس کچھ ہو۔ تب ہی کسی پر احسان ہو سکے گا۔ تب ہی ایثار اور قربانی کی حقیقت کھُل کر سامنے آئے گی کہ آپ ضرورت مند کی ضرورت کو مقدّم رکھتے ہیں یا اپنے بنک بیلنس کی خیر مناتے ہیں۔

اسلام ایک خاص قسم کا سماج رونما کرنا چاہتا ہے۔ قرآن شریف کی ہدایت اور تعلیم کے بموجب اس کے افراد ایسے ہونے چاہئیں :

- جو خرچ کرتے رہتے ہوں خوشی میں اور تکلیف میں۔ جو دبا لیتے ہوں غصّہ اور معاف کرتے ہوں لوگوں کو۔ (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۳۴)
- جو نماز کو پوری شان کے ساتھ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر (ہر طرح) خرچ کرتے رہیں۔ (سورہ رعد ۔ آیت ۲۲)
- جو یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ایسی حالت میں کہ جب کھانا خود ان کو محبوب ہو (وہ خود ضرورت مند ہوں اور نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورتمندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ (سورۂ دھر۔ آیت ۹)
- جن کی کروٹیں اوقات شب میں بستروں سے جُدا رہیں، خدا کا خوف رکھتے ہُوئے، اس کی رحمت کی امید لگاتے ہُوئے اپنے رب کو یاد کرتے رہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہیں (سورہ سجدہ۔ آیت ۱۶)

- جو رات کو بہت کم سوئیں اوقاتِ سحر میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہو اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا)

(سورہ ۵۱ ذاریات۔ آیت ۱۷، ۱۸، ۱۹)

- جو خدا کے عہد کو پورا کریں اس کو توڑیں نہیں اور ان سے جوڑے رکھیں جن سے جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے جو اپنے رب سے ڈرتے رہیں اور اندیشہ رکھیں برے حساب کا۔ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔

(سورہ ۱۳ رعد۔ آیت ۲۱)

- جو پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کی برائی پھیل پڑے گی۔ (سورہ ۷۶ دھر۔ آیت ۷)
- برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہوں (سورہ ۱۳ رعد۔ آیت ۲۲)
- جو کام کریں آپس کے مشورہ سے اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہیں۔ (سورہ ۴۲ شوریٰ۔ آیت ۳۸)
- جو صبر کرنے والے ہوں، سچے ہوں، حکم بجا لانے والے۔ خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات (اوقاتِ سحر) میں،

(سورہ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۷)

اس طرح کا معاشرہ اور سماج ہر ایک اصلاحی تحریک کا مقصد اور نصب العین ہونا چاہیئے لیکن اس طرح کے سماج کی تشکیل و تخلیق میں جو چیز بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ "انفاق" ہے۔ یعنی اپنی دولت کو خرچ کرنا۔

احسان اور لطف و کرم جب ہی ہوتا ہے جب کوئی اپنی جیب سے خرچ کرے

یہی خرچ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ اپنی ضرورت کو پیچھے ڈال کر جب دوسرے کی ضرورت مقدم سمجھی جائے گی اور اس پر عمل کیا جائیگا تو اس کا ثمرہ جذبۂ شکر گزاری ہوگا جو شکر گزار جاں نثار بھی بنا سکتا ہے اور اس کا اثر وہ نظم و ضبط بھی ہوگا جو جذبات جاں نثاری کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتا ہے کہ احسان کرنے والا قدرتی طور پر فرمانروا بن جاتا ہے جس کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔

لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا (سورہ زخرف)

تسخیر کا بہترین عمل احسان ہے۔ خصوصاً وہ احسان جس میں ایثار بھی ہو۔

الانسان عبد الاحسان۔

(۲)

اگر اخلاق کی دُنیا میں ایسا انقلاب آجائے کہ بخل، حرص، طمع، انسانیت کے جوہر مانے جائیں۔ کمزور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا دانشمندی۔ کاروباری مکروفریب۔ جھوٹا پروپیگنڈہ اور نمائش۔ فنی کمالات سمجھے جائیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور شاطرانہ چالوں سے استحصال پر فخر کیا جائے۔ خود غرضی اور زر پرستی کو مذہب اور دھرم بنا لیا جائے تو اس سے پہلے کہ ہمارے دلائل کے قلعے مسمار ہوں ہم خود ہی بحث کا دروازہ بند کر دیں گے۔

لیکن اگر انسانیت اور شرافت کا اتنا وجود اور نمود باقی ہے کہ گرتے کو سنبھالنا، کمزور کی مدد کرنا۔ بے لوث اور بے غرض ہو کر کام کرنا۔ دوسرے کے فائدے کے لیے اپنے فائدہ کو پیچھے ڈال دینا، سیر چشمی، سخاوت، فراخ حوصلگی، معاملہ کی صفائی، سچائی، دیانتداری جیسے اوصاف و خصائل انسانیت کے جوہر اور انسان کے کمالات مانے جاتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر دیا جائے، تو کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ کمالات ظاہر ہوں اور انسانیت اور شرافت کا سر بلند ہو؟

بیشک انفرادی ملکیت ختم ہونے سے چند خرابیاں ختم ہو جائیں گی، مثلاً چور بازاری

ملاوٹ اور جھوٹے پروپیگنڈے کا موقع نہیں رہے گا، مگر اس خوبی کے ساتھ پہلی خرابی یہ ہے کہ چور بازاری وغیرہ کا عمل اگرچہ ختم ہو جائے گا، مگر وہ جذبہ جو چور بازاری یا ملاوٹ وغیرہ کا (محرک) ہوتا ہے ختم نہ ہو گا اور ممکن ہے وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی دوسری راہ نکال لے۔ جو اس سے زیادہ شرمناک اور پُرخطر ہو۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ وہ پاک جذبات جو مکارم اخلاق یعنی رحم و کرم اور صداقت و دیانت کا سبب اور محرک ہُوا کرتے ہیں وہ افسردہ ہو کر بے نام و نشاں ہو جائیں گے اور انسانیت میں ہم پلّہ حیوانیت بن کر رہ جائے گی۔

(۳)

ہمیں حریت اور آزادی کا بھی تجزیہ کرنا ہے جو انسان کا پیدائشی حق ہے اور جس کے ہر قربانی نہ صرف صحیح بلکہ لازم اور واجب مانی جاتی ہے۔

جمہوریت کو عمل اور تجزیہ کی کسوٹی پر کسا گیا تو یہ ناقابلِ انکار حقیقت سامنے آئی کہ خود اپنی رائے اور ووٹ سے اپنے معاملات کی تکمیل کو چند افراد کے ہاتھ میں دے دینے کا نام جمہوریّت ہے۔ جمہوریّت کو اگر جال کہدیا جائے تو غلط نہ ہو گا اگرچہ اس جال کے بُننے والے جمہور ہی ہوتے ہیں اور وہی اس جال کی رسّی چند افراد کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ جال بُرا نہیں بہت اچھا ہے، بشرطیکہ یہ ذمہ دار افراد سچّائی اور دیانت داری کے ساتھ دستور کی پابندی کریں اور صحیح معنے میں اپنے آپ کو جوابدہ سمجھیں لیکن اگر انفرادی ملکیت کو بھی اس جال کی ڈوریوں میں لپیٹ دیا جائے تو پھر دیکھنا ہو گا کہ فرد کی حیثیت با اختیار اور آزاد رہتی ہے یا فرد ایک مشین کا پُرزہ بن جاتا ہے جو "مشین مین" کے اشاروں پر گردش کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور حریتِ فکر یا شخصی آزادی تو درکنار ہوش و حواس سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

حلقۂ در گردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہ

ترجمہ : فیصلہ صرف اللہ کا۔ (سورۃ انعام، آیت ۵۷)

یہی وہ ممتاز مقام اور حدِ فاصل ہے جو اسلام کے مالی نظام کو ایک طرف کیپٹلزم اور سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسری طرف کمیونزم، اشتراکیت اور اشتمالیت سے جُدا کرتی ہے۔

درکفِ جامِ شریعت درکفِ زندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اسلام فرد کو ملکیت عطا کرتا ہے، مگر یہ گوارا نہیں کرتا کہ کسی وقت بھی فرد اس حقیقت کو فراموش کر دے کہ یہ ملک درحقیقت امانت ہے جس کو ملکیت کی تعبیر مستعار دے دی گئی ہے۔

اسلام، دولت کی تقسیم خود کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد فرد کو جو کچھ دیتا ہے وہ بھی اس شرط پر کہ باقیماندہ میں بھی اس کو فیصلۂ خداوندی کی تعمیل کرنی ہوگی۔

اسلام نے فیصلہ کے اصول مقرر کر دیئے ہیں جن کے ماتحت تفصیلات مرتب کرنا اور ان کو نافذ کرنا اس نظام کے حوالہ ہوتا ہے جس کو خلافت کہا جاتا ہے جو ایک طرف حاکم علی الاطلاق یعنی خداوند عالم کی نیابت ہوتی ہے کہ وہ ذمہ داریاں پوری کرے جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے بارے میں اپنے اُوپر لی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ (اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی۔ (سُورۃ ہُود۔ آیت ۶)

دوسری طرف وہ بندگانِ خدا کی نیابت ہوتی ہے تاکہ وہ خدمات انجام پاسکیں

جن کے لیے جماعتی طاقت اور فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔
خلیفہ صرف مخلوق کے سامنے نہیں بلکہ خالق کے سامنے بھی جوابدہ ہے اور اسی لیے وہ پابند ہے کہ جس طرح مخلوق کے معاملات میں وہ شوریٰ سے مشورہ کرے۔ اسی طرح وہ خالق کے عطا کردہ قانون اور دستور کے منشا کو سمجھنے میں شوریٰ سے مدد حاصل کرے۔

خلیفہ کے فرائض اور شرائط وغیرہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، البتہ وہ جس طرح دولت کی تقسیم کرے گا اس کی تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔

سرمایہ داری

ایک مسلمان سرمایہ دار نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دار اپنی دولت کو خالص اپنی مِلک اور ایسی مِلک سمجھتا ہے جس کا وہ پوری طرح مالک ہے اور اس کو من مانی کرنے کا پورا اختیار ہے، لیکن ایک مسلمان جس ایمان کی بنیاد پر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ اپنی دولت کا مالک حقیقی خود نہیں، بلکہ خدا کو قرار دیتا ہے اور اس بنا پر صاحبِ ایمان مسلمان پابند ہوتا ہے کہ دولت کو حاصل کرنے میں بھی مالک کی مرضی پر عمل کرے اس کی اجازت کو شرطِ اوّل سمجھے اس کو اپنے پاس اور اپنے قبضہ میں رکھنے میں بھی اس کے احکام کا پابند رہے۔ پھر خرچ بھی مالک حقیقی کے مقرر کردہ اصول کے مطابق کرے۔
اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی حیثیت سے اس دولت کا مالک بھی تھا تو ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے نہ صرف اپنی دولت بلکہ خود اپنی جان بھی خدا کے ہاتھ بیچ دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی جان اور اس کا مال سب کچھ خرید لیا ہے۔ (سورہ توبہ آیت ۱۱۱)

اسلام اور شاہنشاہیت سے نفرت

تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی بات ہے، ایک نبی اور ایک بادشاہ کا مقابلہ تھا۔ بادشاہ نے اہلِ ملک کو چند طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بادشاہ کی قوم جاگیردار تھی جس نے نبی کی قوم کو غلام بنا رکھا تھا وہ نہ صرف یہ کہ غلام قوم سے مویشی کی طرح کام لیتی تھی، بلکہ اس کی نسل کو بھی خاص حد میں محدود رکھتی تھی کہ تعداد کی زیادتی سے بھی سرکشی کا خطرہ تھا۔ وہ برتھ کنٹرول کے جھمیلے میں نہیں پڑتی تھی، بلکہ جب ضرورت سمجھتی لڑکوں کو ذبح کرا دیتی تھی، صرف لڑکیوں کو باقی رکھتی تھی، کیونکہ ان سے یہ خطرہ نہیں تھا اور گھریلو خدمت کے لیے بھی ان کی ضرورت تھی۔ (سورۂ قصص ۲۸، آیت ۴)

نبی کا مطالبہ تھا کہ غلام قوم کو انسانی زندگی کا موقع دیا جائے۔ اس کے اوپر سے پابندیاں ہٹالی جائیں تاکہ نبی اپنی قوم کو جہاں چاہے لے جائے، مگر بادشاہ اور اس کی قوم اس کے لیے تیار نہیں تھی کہ پشتہا پشت کی غلام قوم کو آزاد کر کے اپنے جاگیردارانہ مفادات کو ختم کر دے۔

یہ کشمکش جاری تھی کہ بادشاہ نے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی قوم کے سامنے یہ سوال رکھا:

"کیا مصر کے ملک اور یہ نہریں جو اس ملک میں بہہ رہی ہیں میری نہیں ہیں اور میں بہتر ہوں یا یہ گھٹیا درجہ کا آدمی جو اپنے آپ کو خدا کا بھیجا ہوا نبی

کہتا ہے مگر اس کے پاس عظمت اور قیادت کا کوئی نشان نہیں ہے
نہ ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہیں (جو سرداروں کا مخصوص نشان ہوتے
ہیں) جس خدا نے اس کو یدِ بیضا کا معجزہ دیا ہے اس نے سونے کے
کنگن کیوں نہیں دیے اور ایسا کیوں نہیں کیا کہ فرشتوں کا ایک دستہ
اس کے حوالے کر دیتا جو اس کے جلو میں رہتا۔"

(خلاصہ آیات ۵۱ تا ۵۳ سورۂ زخرف ۴۳)

دیوتاؤں کو پوجنے والی بادشاہ کی قوم نے نہ صرف یہ کہ اس کو ملک کا
مالک مانا، بلکہ اس نے سب کو جمع کر کے یہ اعلان کیا کہ "میں تمہارا
سب سے بڑا دیوتا" رب اعلیٰ" ہوں۔

(سورۂ نازعات ۷۹، آیات ۲۳ و ۲۴)

تو اس کے جواب میں بھی گردنیں جھکا دیں اور آستانۂ ملوکیت پر پیشانیاں ٹیک دیں۔
نبی اس قوم کو خدا ترس و خدا پرست بنانا چاہتا تھا، مگر قوم کی مفاد پرستی نے
اس کی اجازت نہیں دی۔ اس نے نبی سے بغاوت کی اور شاہ پرست و مفاد پرست
بنی رہی۔ نبی اور بادشاہ کی طویل کش مکش کا آخری نتیجہ قرآن پاک کے الفاظ میں یہ ہوا:

فاغرقنا هم تاللاخرین (سورہ زخرف ۴۳۔ آیت ۵۵، ۵۶)

خلاصہ یہ کہ ہم نے ان سب کو ڈبو دیا یہ قوم (اپنی ہستی کے لحاظ سے)
رفت و گذشت اور داستانِ پارینہ رہ گئی (مگر) بعد میں آنے والوں کے لیے
ایک مثال (اور درسِ عبرت) بن گئی۔

اس مثال نے جہاں اور باتیں بتائیں ملوکیت کے معنی اور اس کی خصوصیات
کی بھی نشاندہی کر دی۔

ملک، بادشاہ، اپنے آپ کو مالک ملک اور اپنی اولاد کو وارث ملک سمجھتا ہے۔
بادشاہت اس کا نصب العین ہوتا ہے اس کے لیے وہ ہر ایک ظلم کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ

انسانوں کے گروہ میں پھوٹ ڈال کر ان کو پارٹیوں اور طبقوں میں بھی بانٹ دیتا ہے اور جب ضرورت سمجھتا ہے انسانوں کے جگر پاروں کو ذبح کرنے اور موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

وہ انسانوں کی گردنیں جھکانے کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کے دل جھکیں اور اس کی بادشاہت کو اپنا عقیدہ بنالیں اور بہت اچھا ہو کہ وہ اس کو اپنا معبود بنالیں اور دیوتا سمجھنے لگیں۔ وہ کسی دستور کی پابندی کو کسرِ شان سمجھتا ہے بلکہ خود اس کا منشا دستور اور اس کی زبان اس کا قانون ہوتا ہے۔ یہ ہے "ملوکیت کاملہ" جس کو فرعونیت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ملوکیت کے اس تجزیہ کے بعد کتاب اللہ کی آیات بیّنات پر نظر ڈالو۔ وہ کس طرح اس کے ہر ایک جزو کی تردید کر رہی ہیں۔ ایک جگہ نہیں بلکہ بار بار یہ مضمون دُہرایا گیا ہے:

زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ سب اللہ کا ہے۔

(سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۰۷، آل عمران ۳ آیت ۱۸۹، سورۂ مائدہ ۵ آیت ۱۷، ۴۰ وغیرہ)

(سورہ اعراف۔ سورہ زخرف۔ سورہ زمر۔ سورہ ص وغیرہ وغیرہ)

وہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۴۷)

ایک مسلمان جس طرح کلمۂ شہادت ادا کرتا ہے اسی طرح قرآن پاک ہر ایک مسلمان سے یہ کہلواتا ہے:

اے اللہ، اے مالک مِلک تو ہی جس کو چاہتا ملک عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے ملک نکال لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ (آلِ عمران آیت ۲۶)

(۲) وارث ملک بادشاہ یا بادشاہ زادہ نہیں، بلکہ زمین اور اس سب

کا جو زمین کے اوپر ہے ۔ وارث اللہ تعالیٰ ہے ۔ (سورہ مریم[19]، آیت ۴۰)
سب آسمان اور ساری زمین اللہ کی میراث ہے ۔ (آل عمران[3]، آیت ۱۸۰)
بلاشبہ زمین اللہ ہی کے لیے ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے ۔ (سورہ اعراف[7]، آیت ۱۲۸)

(۳) حکومت اور قیادت کی جس میں قدرتی صلاحیت ہو وہی اس کا اہل ہوتا ہے اگرچہ مال و دولت اور دنیاوی عزّت و جاہ سے خالی ہو۔
(سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۷)

صلاحیت کے لیے اصل چیز علم اور جسم کی قوت ہے یعنی دماغی اور جسمانی قابلیت نہ کہ مال و دولت اور نسل و خاندان کا شرف ۔
(سورہ بقرہ[2] آیت ۲۴۷)

(۴) یہ صرف فطرت کی کارفرمائی ہے کہ اس نے نوعِ انسان کو قدرت اور اختیار کے ساتھ زمین میں بسایا، آباد کیا اور اس کی زندگی کے سر و سامان مہیّا کیے ۔ (اعراف خلاصہ آیت ۹)

(۵) اور اسی نے تم کو (نوعِ انسان کو) بنایا نائب زمین میں ۔
(الانعام[6] آیت ۱۶۵)

وہی ہے جس نے بنایا تم کو قائم مقام زمین میں ۔
(سورہ فاطر[35]، آیت ۳۹)

مختصر یہ کہ اسلام حکومت اور بادشاہت کو وراثت تو کیا کرتا ملوکیت کے نام سے بھی اس کو نفرت ہے ۔ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے :

اخنع الاسماء عند اللہ رجل یسمّی ملک الاملاک۔

(بخاری شریف ص ۹۱۶)

البتہ وہ انسان کو خلیفہ نائب اور قائم مقام قرار دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السّلام کے بعد اللہ کا خلیفہ وہ ہے جس کو اللہ کے ماننے والے، خدا پرستی، خداشناسی اور خداترسی (تقویٰ) کی بنیاد پر اپنا سربراہ بنائیں اس کے مشیر وہ ہوں گے جو بہتر اخلاق و کردار اور قانونِ خداوندی کی پابندی (تقویٰ) کے معیار پر پورے اترتے ہوں اور خداپرستی کے نمونے ہوں۔ اس ہیئتِ حاکمہ کو خلافت کہا جاتا ہے۔ اس کے سامنے خدا کا دیا ہُوا دستور اساسی ہوتا ہے جس کی روشنی میں سربراہِ خلافت کرتا ہے۔

بیسوی صدی کی جدت یہ ہے کہ اس کو حکومتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے، مگر لسان نبوّت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام نے اس کے لیے لفظ خلافت عطا کیا تھا۔ حضرات صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے اسی عنوان کو اختیار کیا۔ قرآن شریف میں ایسے سربراہ کو خلیفہ فرمایا گیا۔ (سورۂ ص وغیرہ)

حکومت الٰہیہ کا لفظ بے محل اور غیر موزوں بھی ہے اور خلافِ احتیاط بھی۔ خوارج کا ذوق وشوق یہ تھا کہ اگر ان کو حکومت قائم کرنے کا موقع ملتا، تو وہ اس کو حکومت الٰہیہ کہتے، کیونکہ اِنِ الحُکمُ اِلاّ للہ انہیں کا نعرہ تھا۔ جس کے متعلق حضرات صحابہ (رضی اللہ علیہم اجمعین) کا فیصلہ یہ تھا:

الکلمۃ حق ارید بہا الباطل بات ٹھیک ہے مطلب غلط لیا گیا ہے۔

خلیفہ

ایک طرف مالک الملک کا نائب ہوگا کہ اس کے دستور و قانون کو نافذ کرے گا۔ دوسری جانب وہ خداپرستوں کا نمائندہ ہوگا۔ یعنی وہ اکائی ہوگا جس پر پوری ملت

میں پھیلی ہوئی نظامِ ملّت کی شاخیں جُڑ جائیں گی اور اس طرح کثرت میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔ توحید کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پھیلا ہوا نظام ایک ہوتا رہے جو پہلے خلیفۃ اللہ پر پھر مالکِ حقیقی پر جاکر اکائی بن جائے (ان صلاتی ونسکی تا اول المسلمین)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون علیہ ما علیہ

مضمون کے آغاز میں ایک نبی کا حوالہ دیا گیا تھا یہ نبی حضرت موسیٰ علیہ السّلام تھے۔ اور بادشاہ کا نام منفتاح تھا۔ (قصص القرآن) مگر اس زمانہ میں شاہِ مصر کو فرعون کہا جاتا تھا۔ قرآنِ حکیم نے نام کے بجائے "خطاب" کو استعمال کیا ہے یہ حسن ادب کی تعلیم ہے کہ بدترین مخالف کے لیے بھی وہ لفظ استعمال کیا جو اُس کے اور اس کی قوم کے محاورات میں سب سے زیادہ باعزّت نام تھا' اب مُلک، اور بادشاہ سے زیادہ فرعون اور فرعونیت سے نفرت' انسانی ذہن کا پیوند بن چکی ہے۔ انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لیے اگر یہ نفرت ضروری ہے' تو یہ قرآنِ حکیم کا طفیل ہے۔

قانون یا تقسیم فرائض
اور
تعلیم و تربیت

مُلک میں غذائی بحران ہے، غلّہ کی کمی ہے۔ قیمتیں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ ایک خاص جماعت کے علاوہ پورا مُلک فاقہ میں مبتلا ہے۔ بھوک سے نڈھال ہے۔ ساتھ ہی مُلک کی سرحدوں پر دُشمن منڈلا رہا ہے۔ حکومت کو روپیہ کی ضرورت ہے، وہ ایک ٹیکس لگاتی ہے۔ یہ ٹیکس خود اپنی ہی ضرورت ہے، کیونکہ معاملہ خود اپنا، اپنی قوم اور اپنے مُلک کا ہے مگر لوگ اس ٹیکس کو ظلم اور جابرانہ تاوان سمجھتے ہیں جس طرح ممکن ہوتا ہے وہ اس ٹیکس سے بچنا چاہتے ہیں اور اسی کو اپنا کمال سمجھتے ہیں کہ کسی بہانہ سے اپنی رقم بچالیں اور ٹیکس وصول کرنے والوں کی آنکھ میں دھول جھونک دیں۔ موقع ہے تو نوجوانوں کو کسی طرح مشتعل کر کے ان سے تخریبی کارروائیاں کرا لیتے ہیں جن سے مُلک تباہ ہوتا ہے۔ رات دن کے ہنگامے فاقہ مست قوم کو اطمینان اور امن سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے والے دولت مند طبقہ کے جذبۂ انتقام کو کچھ سکون مِل جاتا ہے۔

ٹیکس وصول کرنے کے لیے حکومت کو عملہ رکھنا پڑھتا ہے۔ ایمرجنسی قانون بنانا پڑتا ہے۔ اس کو نافذ کرنے کے لیے پولیس زائد پولیس اور کبھی فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات فوجی اور دیوانی مقدمات کے بے پناہ مصارف بھی

برداشت کرنے پڑتے ہیں، یعنی وصول کردہ ٹیکس کا بڑا حصہ وصول کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے، اگر غذائی بحران یا کسی دشمن کا خطرہ نہ ہو اور پُرسکون حالات میں حکومت کوئی قانون اس لیے منظور کرے کہ عوام کی غربت دُور ہو اور اس کی پست سطح بلند ہو اور اس مقصد کے لیے وہ کوئی ٹیکس لگائے یا ٹیکسوں میں اضافہ کرے تو ٹیکس ادا کرنے والے اس کو ظلمِ عظیم سمجھیں گے اور ممکن ہو گا تو بغاوت کر بیٹھیں گے اور اتنی بغاوت تو وہ اپنا قانونی حق سمجھیں گے کہ انتخاب کے موقع پر اس جماعت کو ووٹ نہ دیں جو اقتصادی مساوات (اور موجودہ اصطلاحات کی زبان میں سوشلزم) کی بنیاد ڈال رہی ہے۔

ایک سمجھدار، تعلیمیافتہ انسانی ہمدردی کا دعویٰ کرنے والا طبقہ ان ٹیکسوں کو ظلم اور جبری تاوان کیوں سمجھتا ہے اور مُلک کے امن کو تباہ کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم قانون کے ذریعہ انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں جس انقلاب کا مدار صرف قانون پر ہو گا۔ وہ لامحالہ جبر و قہر ہو گا وہ حکم اور تعمیل حکم کا ایک سلسلہ ہو گا جس کے ہر قدم پر اشک آور گیس۔ گن مشین گن۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی ضرورت ہو گی۔

کوئی قوم اس طرح کے انقلاب پر فخر نہیں کر سکتی۔ قابلِ قدر وہ انقلاب ہے جو خود قوم کے اندر پیدا ہو، یعنی جذبات بدلیں، تصوّرات میں تبدیلی ہو، انسانی ہمدردی کا نعرہ صرف فیشن نہ رہے بلکہ زندہ اور بیدار دلوں کا جذبہ بن جائے۔ اس حقیقی اور اصطلاحی انقلاب کے لیے سب سے پہلے تعلیم اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہے (یعنی پہلے فرائض متعین کیے جائیں، پھر ان فرائض کی اہمیت اس طرح ذہن نشین کرائی جائے کہ جذبات ہم آہنگ فرائض ہو جائیں یعنی فریضہ محض ڈیوٹی اور جبراً قہراً تعمیل حکم نہ رہے بلکہ قلب مضطرب کا مطالبہ بن جائے۔

قرآنِ حکیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات میں انقلاب برپا کرتا ہے وہ حکومت کو خطاب نہیں کرتا بلکہ عوام کو مخاطب بناتا ہے۔ پہلے ان کے فرائض معین کرتا ہے پھر ان فرائض کا احساس دلاتا ہے۔ اور قانون سازی کے بجائے ذہن کی ساخت درست کرتا ہے کہ فرائض بارِ خاطر نہ رہیں بلکہ تقاضائے خاطر اور دِلی جذبہ بن جائیں۔

قرآنی تعلیمات کی پرداخت یہ ہے کہ قانون نہیں بلکہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ تمام انسان مساوی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے انسانو! ہم نے تم کو پیدا کیا۔ ایک مرد اور عورت سے اور تمہارے قبیلے اور خاندان اس لیے کر دیے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔" (خاندان اور نسل عزت کی بنیاد نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی عزّت سب سے زیادہ ہے جو اعلیٰ اخلاق و کردار اور خدا ترسی (تقویٰ) میں سب سے زیادہ ہو۔" (سورۂ حجرات ۴۹، آیت ۱۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"کسی قوم کے لیے درست نہیں کہ وہ کسی دوسری قوم کا مذاق بنائے اس کو حقیر سمجھے۔ بہت ممکن ہے جس کو حقیر سمجھ رہے ہو وہ تم سے بہتر ہو۔"
(سورہ مذکورہ آیت ۱۱)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم ہے کہ:

"تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح ہیں۔" الناس کاسنان المشط۔
(شفا، قاضی عیاض)

(۲) غریبوں کا پیٹ بھرنا۔ ان کی فاقہ مستی دُور کرنا، قانون نہیں بلکہ خود تمہارا شخصی اور ذاتی فرض ہے قیامت کے دن جب ایک گروہ کو دوزخ کی طرف دھکیلا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ "تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا" تو وہ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے

تھے اور نہ غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔" (سورۂ مدثر۔ آیت ۴۲ تا ۴۴)

سونے چاندی کی سلاخیں جو تم نے تجوریوں میں بند کر کے رکھ رکھی ہیں اگر ان کو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو یہ سلاخیں دوزخ کی آگ میں تاپی جائیں گی پھر ان سے ان جوڑنے والوں کی پیشانیاں اور کروٹیں اور کمریں داغی جائیں گی کہ یہ ہے وہ جس کو تم اپنے لیے کنز بنا کر رکھا کرتے تھے۔ اب چکھو اپنے کنز کو جس کو تم جوڑا کرتے تھے۔

(سورۂ توبہ ۹، آیت ۳۴، ۳۵)

"تم خود مستحق لعنت ہو اور خدا کی رحمت سے دُور ہو۔ اگر بھاؤ بڑھانے کے لیے کسی جنس کو روک رکھو اور بازار میں نہ لاؤ۔" (المحتکر ملعون (حدیث)

(۳) صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر تمہاری اولاد دوزخ کا کندہ ہوگی، لہٰذا خود تمہارا فرض ہے کہ اپنی اولاد کو دوزخ سے بچاؤ۔ اس کو زیورِ علم سے آراستہ کرو۔ اس کی تربیت کرو اور سدھاؤ، عمل کا خوگر بناؤ۔ اس فرض کو خود انجام دو۔ تم خود انجام نہیں دے سکتے تو دوسروں سے اس فرض کو انجام دلواؤ۔ اس کا نظام قائم کرو۔ قوا انفسکم و اھلیکم نارا۔
(سورہ تحریم ۶۶، آیت ۶) و حدیث "الا کلکم راعٍ" وغیر ذالک

(۴) جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی۔ جو اسلام و ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل جہاد کرتا رہے۔ صاحبِ مال جہاد بالمال بھی کرے گا۔ یہ اس کا اپنا فرض ہے کہ اتنا خرچ وہ کرے کہ دفاع کی ضرورتیں پوری ہوں اور مُلک کو دفاعی استحکام حاصل ہو۔ جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ (سورہ توبہ) وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ (سورۂ انفال)

یہ قوم کی بے حسی ہوگی کہ قانون کے ذریعے اس کو جہاد بالمال یا جہاد بالنفس پر آمادہ کیا جائے۔

(۵) اسلام سیاسی اور مالی فرائض وواجبات کے سلسلہ میں اخلاقی نقطۂ نظر سامنے رکھتا ہے۔حقیقی جہاد یہ ہے کہ انسان اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرے۔ اسی قربانی کی آخری منزل یہ ہے کہ اپنی جان بھی قربان کردے۔

مالی فرائض کی بنیاد یہ ہے کہ بخل، خود غرضی، حرص وطمع جیسی بُری خصلتوں سے نفس مومن پاک ہو۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت وثروت کی محبّت قومی اور ملی ضرورتوں سے آنکھ بند کردے۔ یہی وجہ ہے کہ مالی فرائض کو اسلام نے زکوٰۃ کا عنوان دیا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں پاکی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد ہے:

(اے پیغمبر) ان لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو (بخل اور طمع کی بُرائیوں سے) پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو (ان کو سدھاؤ اور ان کی تربیت کرو کہ وہ ہمدردیٔ خلقِ خدا، سیر چشمی، سخاوت اور امدادِ باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہوجائیں اور یہ باتیں ان کی طبیعتِ ثانیہ بن جائیں) اور ان کے لیے دعاءِ خیر کرو۔ بلاشبہ آپ کی دُعاء ان کے لیے آسودگی ہے جس سے ان کے دِلوں کو سکون مِلتا ہے (راحت پہنچتی ہے)

(سورہ توبہ ۹ آیت ۱۰۲)

مختصر یہ کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض سمجھے جاتے ہیں ان کو اہلِ ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مُبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی چیرہ دست طاقت نہ ہوگی جو قانون کے ذریعہ اپنی چیرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ حکومت ذریعہ تعاون ہوگی۔ نظامِ حکومت امدادِ باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر فریق دوسرے کا مددگار دعاگو اور احسان مند ہوگا۔ قوم اپنے سربراہ اور اس کے عمال کی احسان مند اور شکر گزار اس لیے ہوگی کہ ان

کے ذریعہ سے اس کے ذاتی فرائض صحیح طور پر بحسن و خوبی انجام پا رہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے کارپرداز قوم کے شکرگزار اس لیے ہوں گے کہ قوم کے تعاون نے ان کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کر دیا ہے۔ آیت مذکورہ بالا کا ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تزکیہ اور اطمینان و سکون کی یہ رُوح جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دورِ مبارک و مسعود میں کارفرما ہے۔ قومی کارکنوں ذمہ داروں، اور قوم کے افراد میں اسی طرح کارفرما ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا طرزِ عمل اور آپ کا کردار ایک نمونہ اور ایک مقدس سانچہ ہے۔ پُوری اُمّت اور اُمّت کے ہر ایک طبقہ اور ہر ایک فرد کو اسی سانچہ میں ڈھلنا چاہیے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مندرجہ ذیل ارشادِ گرامی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے:

خیار ائمتکم الذین تحبونہم ویحبونکم وتصلون علیہم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونہم ویبغضونکم وتلعنونہم ویلعنونکم

تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کو دُعائیں دو وہ تم کو دُعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں تم ان پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں۔ (مسلم شریف)

مختصر یہ کہ قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہدایت کرتا ہے کہ کسی بھی منصوبہ کے شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ذہنوں کو اس درجہ ہموار کر لیا جائے کہ لوگ اس فرض کو خود اپنا فرض سمجھیں ان کو اس بات کا پُورا احساس بلکہ جذبہ یہ ہو کہ یہ کام خود ہمارا کام اور ہمارا فرض ہے جس کو خود ہمیں بلا کسی امداد کے کرنا چاہیے جب عوام کا یہ احساس اور یہ جذبہ ہو جائے گا، تو وہ حکومت کے تعاون کی قدر کریں گے اور حکومت بھی اس کام کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بہت معمولی خرچ سے بہت تھوڑی مدت میں انجام دے سکے گی۔

خرچ کس کے لیے

ہم اپنے آپ کو بہت اُونچا سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اپنی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ صرف انسانی ہمدردی کے لیے کام کریں، لیکن نوعِ انسانی بہت سے خانوں میں بٹی ہوئی ہے کہیں ذات برادری کے خانے ہیں، کہیں رنگ و نسل کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا قدم ان دیواروں کو پھاند کر آگے بڑھتا ہے تو کہیں پہاڑوں کے جغرافیائی حصار اس کو روک دیتے ہیں۔ کہیں سمندروں کے طوفان اور کہیں دریاؤں کی موجیں رکاوٹ بن جاتی ہیں ہم ان کو قدرتی حدود سمجھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمدردی نوع انسان کے اُچھلنے کودنے والے جذبات وطنیت اور قومیت کی زنجیروں میں جکڑبند ہوجاتے ہیں اور اس طرح خدا پرستی کے نام پر نہ سہی قوم پرستی کے نام پر ہر قوم کا شوالا الگ بن جاتا ہے اور جس مقابلہ اور جنگ و جدال کے لیے مذہب بدنام ہے وہ قومیت اور نیشلزم کے نام پر شروع ہوجاتا ہے اور وہ خون خرابہ ہوتا ہے جس سے ماضی اور خصوصاً ترقی کے دعوے دار "حال" کی تاریخ کا ہر ایک ورق رنگین بلکہ ملوث اور متعفن ہے۔ (معاذاللہ)

اسلام، قومیت کے نام پر کسی برتری کو گوارا نہیں کرتا انتہا یہ کہ وہ ایسے لوگوں کو آخرت کی فلاح اور کامیابی سے محروم قرار دیتا ہے جن کی جدوجہد کا نصب العین اپنی قوم کو برتر بنانے تک محدود رہے۔ قرآن کا اعلان ہے: تلك الدار الآخرة الآیۃ

(سورہ قصص ۲۸، آیت ۸۳)

(یہ پچھلا گھر۔ عالم آخرت) ہم ان کے لیے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔

قرآنِ کریم کی ہدایت ہے:

"کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ بنائے۔ بہت ممکن ہے جس کا مذاق بنا رہے ہو وہ تم سے بہتر ہو۔" (سُورہ حجرات، آیت ۱۱)

نیز ارشاد ہے:

"یہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ کسی قوم کا بغض تمہیں اس بات پر آمادہ کردے کہ تم عدل و انصاف کے راستہ سے ہٹ جاؤ (ہر حال میں عدل کرو) انصاف سے کام لو۔" (سورہ مائدہ، آیت ۸)

بس اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ آپ کی جدوجہد اور آپ کا خرچ "توجہ القوم" ہو آفاقیت کے دائرہ کو سب سے زیادہ وسیع مانا جاتا ہے، مگر اسلام اس وسیع دائرہ میں بھی وسعت پیدا کرتا ہے اور ہمدردی کو صرف نوع انسانی تک محدود نہیں رکھتا۔ اسکے نزدیک ہر ایک جاندار ہمدردی کا اتنا ہی مستحق ہے جتنا کوئی ہم رنگ و ہم نسل مستحق ہے۔

ہم نسل انسان مستحق ہے۔

جبکہ اس کی ہمدردی اور خدمت کا دائرہ اتنا وسیع ہے تو وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ خرچ کرنے (انفاق) کا نصب العین ہمدردی نوع انسان سے آگے نہ بڑھے۔ فی سبیل اللہ کو سب سے وسیع دائرہ اور سب سے اونچی سطح قرار دیتا ہے نہ صرف انفاق اور جود و عطا بلکہ ہر ایک فعل خودغرضی سے پاک ہونا چاہیے اگر اپنا کوئی مفاد سامنے ہے تو ایک طرح کی خودپرستی ہے۔

خودپرستی، قوم پرستی یا وطن پرستی سے بالاتر خداپرستی ہے، لہٰذا ہر ایک جدوجہد اور ہر سعی و عمل کا نصب العین خداپرستی ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے اور ارحم الراحمین ہے۔ وہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا پروردگار ہے۔ وہ رب العالمین ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا عمل اس کی تمام مخلوق کے لیے ہو۔ اس کی افادیت کسی خاص طبقہ تک محدود نہ رہے، بلکہ رب العالمین کے ہر ایک پیدا کردہ اور ہر ایک پروردہ کے لیے عام ہو۔

اسلام اسی وسعتِ نظری کی تعلیم دیتا ہے اور اس کو ضروری گردانتا ہے۔ اس کے

علاوہ تقاضائے توحید بھی یہی ہے کہ علمبردار توحید کا ہر ایک عمل اور فعل اس ذاتِ واحد کے لیے ہو جس کا یہ ہے اور جس کا ہو گیا۔ ان صلاتی ونسکی الآیۃ (سورۂ انعام)

"میری نماز، میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

خدا پرست حکومت کو جو ٹیکس ادا کریں اس کا نصب العین بھی لوجہ اللہ ہونا چاہیے؛ چنانچہ ان ٹیکسوں کو قرآنِ حکیم نے "صدقہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

(سورہ توبہ، آیت ۶۰ و آیت ۱۰۳ وغیرہ)

شخصی حکومت ملوکیت اور جمہوریت

شخصی حکومت اور ملوکیت میں فرق کرنا ہوگا اور یہ بات بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ جمہوریت ہر حال میں شخصی حکومت سے بہتر ہے۔

نظامِ حکومت کی کامیابی یہ ہے کہ ملک خوشحال، ترقی پذیر اور سماج و معاشرہ پُرامن و مطمئن ہو۔ اگر جمہوریت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ صرف الفاظ کی مالا جپی جائے اور خلقِ خدا کو مصیبت میں ڈالا جائے۔ اگر ایک حکمران مسلّمہ دستور اور مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کا اتنا ہی پابند ہے جیسا کسی جمہوریت کا وزیرِ اعظم پارلیمنٹ کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے تو اس کی بادشاہت اسی حد تک قابلِ مذمت رہ جاتی ہے کہ اس نے ملک کو وراثت قرار دے رکھا ہے۔ اس کی ملوکیت کو فرعونیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

اسلام اس درجہ کی ملوکیت کو بھی پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو بھی "ملک عضوض" (کاٹ کھانے والی حکومت) فرمایا ہے، لیکن اگر قوم حسنِ انتخاب کی صلاحیت سے محروم ہے تو اسلام ایسے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا حکم بھی نہیں دیتا۔

اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام جس طرح ملوکیت کی ہر ایک قسم سے بیزار ہے مسلمانوں کے عمل نے بادشاہت سے بے زاری کا ثبوت نہیں دیا، مگر اس کا سبب اربابِ حل و عقد اور رہنمایانِ ملت کی بُزدلی بے حسی یا موقع پرستی نہیں، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ابتداء کے چند خلفاء کے بعد ایسا دور کبھی نہیں آیا کہ قرآنی اصول یعنی بہتر اخلاق و کردار (تقویٰ) کے معیار پر انتخاب کیا جاتا۔ دوسری طرف

مسلمان بادشاہوں کی غالب اکثریت وہ رہی ہے جو مطلق العنانی کے باوجود قانون کی پابند رہی۔ فوجی امور میں بیشک وہ آزاد رہا کرتے تھے، مگر عدالت میں بادشاہ اور عام باشندۂ ملک کی حیثیت یکساں ہوتی تھی۔

جماعت اور پارٹی کے مینوفسٹو کی بنیاد پر انتخاب بیشک یورپ کی ایجاد ہے مگر ایک دو ملک کو چھوڑ کر پوری دنیا کے تمام ممالک کا تجربہ یہ ہے کہ مینوفسٹو کا خواب شیریں (سندر سپنا) شاذ و نادر ہی شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔ انتہا یہ کہ الکشنی وعدہ اور دھوکا دہی کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے کہ ایک پارلیمنٹ یا کیبنٹ فرعون نے بھی بنا رکھی تھی (قرآنِ حکیم نے اس کو لفظ "ملا" سے تعبیر کیا ہے) والملأ جماعة یجتمعون علی رای" (المفردات)

مگر بدقسمتی یہ تھی کہ اس ملا (پارلیمنٹ یا کیبنٹ) کا مذہب فرعون پرستی تھا۔ اسی پارلیمنٹ نے فرعون کو مشتعل کرنے کے لیے کہا تھا:

"کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) اور اُس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ ملک میں بدامنی پھیلائیں۔ اور آپ کو اور آپ کے معبودوں (دیوتاؤں) کو ترک کر دیں۔"

جس کا جواب فرعون نے دیا تھا:

"ہم ان کے لڑکوں کو تہِ تیغ کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے (کہ ہماری باندیاں بن کر رہیں) ہمیں اُن کے اُوپر پورا قابو ہے۔"

اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

"خدا سے مدد مانگو اور صبر سے کام لو۔ بلاشبہ ملک اللہ کا ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا (وہ تم کو بھی وارثِ ارض بنا سکتا ہے) انجام کار انہیں کے لیے ہوگا جو متقی ہوں گے۔" (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۲۵ تا ۱۲۸)

مطلب یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ یا اس کی اکثریت کا مزاج فسطائی ہو تو یہ جمہوریت بھی فرعونیت ہے۔

مُسلمان بادشاہ کا کردار

ہم نہ بادشاہت کے حامی ہیں نہ بادشاہوں کے مدح خواں، مگر جب مقطع میں بات آگئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظاہر کردیں کہ مُسلمان بادشاہوں کو کس بات کی تلقین کی جاتی تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ جو بادشاہ کامیاب مانے گئے ہیں وہ اس تلقین پر عمل بھی کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اگرچہ خلفاء عباسیہ کی نظر میں معتوب رہے، لیکن تقریباً نصف صدی تک انقلابی خلفشار کے بعد جب طالع اور اقبال نے زمامِ اقتدار خلفاء عباسیہ ہی کے حوالے کردی اور یہ واضح ہوگیا کہ اب انقلاب کی کوشش کرنا سراسر فساد فی الارض ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے بلند پایہ شاگرد امام ابو یوسفؒ نے منصب قضا قبول کرلیا۔ پھر خلیفۃ المسلمین ہارون الرشید کی فرمائش پر نظام مالی کا وہ دستور اساسی مرتب کیا جو کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں تمہید کے سولہ صفحات ہیں، ان میں احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ و تابعین سے اخذ کرکے وہ اصول اور نصیحتیں درج کی ہیں جو مملکت کے سربراہ کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

جس عمارت کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو وہ سربلند نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ اس کو جڑ سے اکھاڑ ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قیادت آپ کو عطا فرمائی ہے، ہرگز ایسا نہ ہو کہ آپ اسے برباد کر ڈالیں۔

آج کے کام کو کل پر مت رکھو، آرزوئیں بہت ہوتی ہیں، مگر فرشتہ موت ان سے پہلے آپہنچتا ہے۔ موت سے پہلے عمل کرلو۔ موت کے بعد کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔ آپ ٹیڑھے نہ چلیں۔ پھر رعیت بھی ٹیڑھی راہ اختیار کرلے گی۔ اس کا بار آپ پر ہوگا۔ آخرت کے کام کو دُنیا کے کام پر مقدم رکھو، آخرت سدا رہنے والی ہے۔ دُنیا ختم ہورہی ہے۔ تمام انسانوں کو حکمِ خداوندی کے بارے میں ایک سطح پر رکھو، وہ اجنبی ہوں

یا رشتہ دار، خدا کے معاملہ میں کسی کی ملامت کا خوف ہرگز مت کرو۔ تقویٰ اور پرہیزگاری دِل سے ہوتی ہے، زبان سے نہیں۔ دِل میں خدا کا خوف پیدا کرو۔ دنیا کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر جب میدانِ حشر میں خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہوگا تو ایسا معلوم ہوگا کہ دُنیا میں صرف ایک صُبح اور ایک شام قیام ہُوا تھا۔

قیامت کے روز بارگاہِ خداوندی میں پہلے چار چیزوں کا حساب دینا ہوگا۔ اس کے بعد بندہ عدالت کے کٹہرہ سے نکل سکے گا (١) جو مال تمہارے پاس تھا وہ کہاں سے حاصل کیا تھا اور کس کام میں صرف کیا (٢) جو تم جانتے تھے اس پر کیا عمل کیا (٣) جو عمر ملی تھی وہ کن باتوں میں ختم کی (٤) جو جسم تمہیں میسر تھا کن کاموں میں اس کو بوسیدہ کیا۔

قوم کے ذمہ داروں، اولی الامر کو اللہ تعالیٰ نور عطا فرماتا ہے۔ قوم اس نور سے فیض یاب ہوتی ہے۔ اس نور کی روشنی یہ ہے کہ اللہ کی مقرر کردہ حد بندیاں صحیح طور سے قائم رکھی جائیں، حق داروں کو ان کے حقوق پُورے پُورے ملیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقوں اور سنتوں کو جاری کیا جائے۔ یہ وہ خیر ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا، اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ حاکم کا ظلم رعیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ نااہل اور غیر معتمد لوگوں کو کام پر لگانے سے رعیت برباد ہوجاتی ہے۔ کامیابی یہ ہے کہ دن اور رات کا کوئی حصّہ بھی ایسا نہ گزرے جس میں زبان اللہ کے ذکر سے متحرک نہ ہو۔ تسبیح و تہلیل اور درود سے ہمیشہ زبان تر رہنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ محبوب چیز اصلاح ہے اور سب سے مغضوب بات یہ ہے کہ انسان فساد پھیلائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ قیامت کے روز قریب تر اور محبوب تر امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور سب سے زیادہ مغضوب امام ظالم ہوگا۔

سیدنا حضرت عمر فارُوقِ اعظم رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو کر زندگی سے مایوس ہوگئے، تو آپ نے ہونے والے خلیفہ کے لیے چند وصیتیں تحریر کرائی تھیں ان میں یہ وصیت بھی تھی:

"جن سے (جن غیر مسلموں) سے معاہدہ ہُوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس پناہ میں رخنہ نہ ڈالا جائے۔ جو معاہدہ ہُوا ہے پُوری احتیاط سے اس پر عمل کیا جائے۔ ان پر کوئی حملہ کرے تو ان کا دفاع ہمارا فرض ہے اور خود اُن کو ان کی طاقت اور برداشت سے زیادہ کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب کو محصول وصول کرنے کے لیے مقرّر کیا، تو ان کو ہدایت فرمائی کہ محصول کے سلسلہ میں سردی یا گرمی کا لباس فروخت کرنا اور ان کی گزر کا جو غلہ ہے اسے نہ فروخت کرنا۔ کھیتی کے لیے بھی مویشی کی ضرورت ہے وہ نہ فروخت کرنا، مار پیٹ یا کھڑا کرنے کی سزا نہ دینا، خانگی ضرورت کا سامان فروخت نہ کرنا، کیونکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ضروریات سے جو فاضل ہو اس کو وصول کریں۔

یہ صاحب جن کو مقرر کیا تھا انھوں نے عرض کیا کہ حضرت مَیں نرمی برتوں گا، تو جیسے جارہا ہُوں ویسے ہی واپس آجاؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں؛ چنانچہ یہ صاحب گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہدایات کی پابندی کی، مگر جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے۔

جب سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے فرمایا تھا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنے پیشرو بزرگ (صدیق اکبرؓ) اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تقرب حاصل کریں تو آپ کا کُرتا پیوند لگا ہونا چاہیے، تہ بند اُونچا رہے۔ چپّل اور موزوں میں ٹکّی لگی ہو دُنیا کی آرزو نہ ہو اور پیٹ بھر کھانا نہ کھاؤ۔

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو راتوں کو رویا کرتے تھے کہ دُور دراز گوشوں میں خدا کی مخلوق پھیلی ہُوئی ہے جن کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور مجھے ان کی حالت کی خبر نہیں خدا کو کیا جواب دُوں گا۔ (بالاختصار یہ ہونا چاہیے، مسلمان بادشاہ کا کردار)۔

قومی مصارف اور ذرائع آمدنی

کتابُ اللہ کے اشارات

قرآنِ حکیم کا یہ کمال ہے کہ اس نے جہاں صَرف (خرچ) کا کوئی مد بیان کیا ہے تو ساتھ ہی اس کی آمدنی کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

نیکی

(۱) دُنیا کے ہر ایک مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو نیک بنانا چاہتا ہے۔ قرآنِ حکیم نیکی کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ مالی نظام کے اس حصّہ کو جو فرد کی معیشت اور معاشرت سے تعلّق رکھتا ہے اس کو بھی وہ نیکی کا ضروری باب گردانتا ہے کہ جب تک اس پر عمل نہ ہو لفظ نیکی بے معنیٰ ہے اور کوئی فرد خواہ کتنا ہی عبادت گذار، کتنا ہی شب بیدار ہو، مسلسل روزوں پر روزے رکھتا ہو اور رات دن تسبیح جپتا ہو، جب تک نیکی کے اس باب کو عمل میں نہیں لائے گا وہ صالح اور نیک نہیں ہوگا۔

سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۷ کا خلاصہ یہ ہے:

"نیکی اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ (عبادت کے وقت) اپنا مُنہ پورب کی طرف پھیر لو یا پچھم کی طرف (اور ظاہری رسوم کی پابندی کرو) نیکی یہ ہے کہ اپنی اصلاح اور شخصیّت کی تعمیر اس طرح کرو۔

(الف) اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، خدا کے

تمام نبیوں پر تمہارا ایمان ہو۔ (عقیدہ صحیح ہو جو بنیادی شرط ہے)۔

(ب) اور اس وقت جبکہ (اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتیں موجود ہوں، ان کی ذمہ داریاں تم پر لازم ہوں جن کے پورا کرنے کے لیے خود تمہیں) مال محبوب ہو۔ تم یہ محبوب مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں کی امداد، سائلوں کا سوال پورا کرنے اور گردنوں کو چھڑانے میں خرچ کرو۔

(ج) پورے آداب، شرائط کے ساتھ نماز قائم کرو۔

(د) زکوٰۃ ادا کرو۔

(ہ) اپنی بات کے پکّے رہو، جب قول و قرار کرو، تو اس کو پورا کرو۔

(و) اور تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں صبر (ضبط و تحمل اور استقلال) سے کام لو۔ یہی ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہیں اور یہی ہیں متقی اور پرہیزگار۔

اس آیت میں خرچ کے دو مد بیان کیے گئے ہیں:

(۱) ضرورت مندوں کی امداد۔ وہ بالغ ہو یا نابالغ (یتیم)، رشتہ دار ہوں یا اجنبی، مسافر (وطن یا غیر وطن کے) یا سائل۔

(۲) گردن چھڑانا، یعنی غلام آزاد کرنا یا مقروض کا قرض ادا کرنا۔

خرچ کی طرح آمدنی کے بھی دو مد بیان فرمائے گئے ہیں ۱۔ زکوٰۃ، ۲۔ عطیہ — زکوٰۃ کی رقم ضرورت مندوں پر خرچ کی جائے گی، البتہ ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ زکوٰۃ دینے والے پر واجب ہو جاتا ہے (مثلاً اولاد یا ماں باپ) ان کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جائے گی۔ میاں بیوی بھی ایک، دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ (مفتی بہ)

زکوٰۃ کی رقم کسی تبادلہ میں بھی نہیں دی جاسکتی، لہٰذا آزاد کرنے کے لیے جو غلام خریدا جائے گا اس کی قیمت اپنے پاس سے دینی ہوگی جس کو ہم نے عطیہ کہا ہے، البتہ اس

سے اسلام کا مزاج معلوم ہو گیا کہ اس کی نظر میں گردن چھڑانے کو وہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کو نیکی کے مفہوم میں داخل اور خرچ کی ضروری مدات میں شامل کیا گیا ہے

ان مدات کے لیے ضروری نہیں ہے کہ نظامِ حکومت کو واسطہ بنایا جائے۔ اگر مُسلمانوں کی حکومت، نہ ہو یا مُسلمانوں کی حکومت، مطالبہ نہ کرے تب، بھی نیک کردار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان مدات پر خرچ کیا جائے یعنی جس طرح نماز روزہ یا خود اپنے اہل وعیال کا نفقہ ہر مسلمان پر ہر حال میں فرض ہے خواہ وہ دارالاسلام میں ہو یا کسی غیر مُسلم حکومت کے ماتحت، زندگی گزارتا ہو ایسے ہی خرچ کے یہ مدات بھی مسلمان کے لیے لازمی فرائض میں داخل ہیں۔

دوسری ضرورتیں اور مدّاتِ آمدنی

غریبوں کا پیٹ بھر دینے، ضرورت مندوں کی ذاتی اور شخصی ضرورتیں پُوری کر دینے غلاموں کی گردن چُھڑا دینے یا مقروضوں کا قرض ادا کر دینے سے ترقی پذیر قوم وملت، کی تمام ضرورتیں پُوری نہیں ہو جاتیں۔

امتِ اسلامیہ جس کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ حق وصداقت کی علمبردار بن کر پُوری دُنیا کو اس حقیقت کا مشاہدہ کرائے کہ وہ دستورِ اساسی اور کانسٹی ٹیوشن یا مینی فسٹو جس کو کلمۃ اللہ کہنا چاہیے صرف اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ سب سے بلند و بالا ہے) وہ اپنے اس نصب العین میں کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک، روحانی عظمت واحترام، اخلاقی اقتدار و برتری کے ساتھ مادی ترقیات میں بھی اس کا قدم سب سے آگے، اور اتنا آگے نہ ہو کہ دوسرے قدم وہاں تک پہنچتے پہنچتے تھک جائیں

افراد کی ہیئتِ اجتماعی کا نام مِلت ہے۔ یہ ہیئت اجتماعی ترقی کے قطب مینار پر اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب کہ اس کے افراد کی غالب اکثریت، ترقی کے تمام زینے

طے کر چکی ہو۔

اگر مسلمان ارشادِ ربانی (وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ) کے مضمرات، کو اپنا جذبۂ عمل بنا لیں تو لامحالہ ان کی تعلیم کا میدان دوسری قوموں کے تعلیمی میدانوں سے بہت زیادہ وسیع ہوگا اور اس بنا پر ان کے تعلیمی مصارف بھی دوسری قوموں کے مقابلہ پر بہت زیادہ ہوں گے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے صرف، وہ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں کافی نہیں ہوں گی جن میں عصری تعلیم۔ سائنس۔ کیمسٹری۔ فلسفہ طبیعیات۔ فلکیات یا ڈیفنس اور دفاعی و جنگی فنون کی تعلیم دی جاتی ہو اور ان کا ماہر بنایا جاتا ہو، بلکہ ان کو ایسی درسگاہوں، تربیت گاہوں اور ایسے دار العلوموں کی بھی ضرورت اور اتنی ہی شدید اور بنیادی ضرورت، ہوگی جہاں مذہبی تعلیم اور اخلاق اور روحانیت کی تربیت، اور تکمیل ہو سکے تاکہ مسلم نوجوانوں کا طبقہ جس طرح عصری علوم اور فنونِ جدیدہ کا ماہر ہو۔ وہ خدا شناسی، حقیقت شناسی، حقوق شناسی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کا بھی کامل نمونہ ہو کہ وہ "شہداءَ عَلَی النَّاس" بن سکے اور خداوندِ عالم کی حجت پوری ہو سکے۔

بالفاظ دیگر اگر کمیونسٹ روس کے بجٹ، کا ساٹھ فیصدی تعلیم پر صرف ہوتا ہے، تو خلافتِ اسلامیہ کو اپنے بجٹ، کا اسّی فیصدی تعلیم کے لیے مخصوص کرنا پڑے گا تاکہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی ہو سکے اور دنیا امام غزالیؒ ابن رشد اور رازی جیسے ائمہ علوم و فنون کے فیوض برکات سے بہرہ یاب ہو سکے۔

یہ کتنی رقم ہوگی کہاں سے فراہم ہوگی۔ قرآنِ حکیم اس کا جواب دینے سے پہلے یہ تحقیق کرتا ہے کہ یہ ضرورت کس کی ہے۔ ضرورت مند کون ہے؟

تعلیم و تربیت اور ترقی، فرد کی ضرورت ہے یا اللہ تعالیٰ کی؟ بعنوان دیگر فرد کی ضرورت ہے یا حکومت کی۔ اپنی اور اپنی اولاد کی ترقی کی ضرورت، بڑے سے بڑے دولتمند امیر کبیر کو بھی ایسی ہے جیسے معمولی آدمی کو۔ اس ضرورت کے لحاظ سے امیر کبیر اور بڑے سے

بڑا دولت مند بھی حاجت مند اور قرآن حکیم کے الفاظ میں فقیر ہے۔

تعلیمی ضرورتوں کے علاوہ اور بھی ضرورتیں ہیں جن کا تعلق پوری قوم کی تعمیر و ترقی سے ہے۔ مثلاً سڑکیں، نہریں، پل، مسافر خانے اور ترقی پذیر دور کے لحاظ سے ذرائع مواصلات و مراسلات (ڈاک، تار، بحری اور ہوائی سروسیں وغیرہ) مگر یہ تمام ضرورتیں خود قوم کی ضرورتیں ہیں۔ خدا کی ضرورتیں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان یہ ہے کہ وہ ان مدات پر خرچ کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو ان تمام رقوم کو جو ان مدات کے لیے عطا کی جائیں اپنے ذمہ قرض مان لیتا ہے اور اس مدد کو خود اپنی مدد قرار دیتا ہے اور بڑی پختگی سے وعدہ فرماتا ہے:

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (سورۃ حج ۲۲ آیت ۴۰)

یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ قوت رکھنے والا سب پر غالب ہے۔

ان وسیع اور ہمہ گیر ضرورتوں کو سامنے رکھیے پھر سورہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری آیتوں کا مطالعہ کیجیے۔ ان آیتوں کے مفہوم اور منشا پر غور کرتے ہوئے جیسے جیسے صرف کی مدات آپ کے سامنے آئیں گی مدات آمد کا سراغ بھی مل جائے گا۔

آیات کا مضمون یہ ہے (اللہ تعالیٰ اہل ثروت کو خطاب فرما رہے ہیں)

"دیکھو، دیکھو، تم ہی کو خاص تم ہی کو دعوت دی جا رہی ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ پھر تم میں سے کچھ وہ ہیں جو (خرچ نہیں کرتے) بخل کرتے ہیں۔ یاد رکھو جو بخل کرتا ہے وہ خدا سے نہیں خود اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے (یہ تعلیمی، تعمیری، ترقیاتی اور دفاعی ضرورتیں خود تمہاری ضرورتیں ہیں جن کی بنا پر تم اگر دولت مند ہو تب بھی) فقیر اور حاجت مند ہو۔ اس حقیقت کو سمجھو اور پورے حوصلہ سے خرچ کرو (اور اگر خرچ سے) منہ موڑتے ہو (تو یقین رکھو تباہی

اور بربادی تمہارا انتظار کر رہی ہے، مگر برباد تم خود ہو گے۔ خداوند عالم کی ذات، باقی اور بے نیاز ہے اسے کبھی کوئی زوال نہیں آسکتا۔ تم فنا ہو جاؤ گے) تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو تمہارا بدل کرے گا۔ وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ (سورۂ محمد ۴۷، آیت ۳۸)

تناسب

سالانہ بچت کا ڈھائی فیصدی جس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ فقیروں، یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا مخصوص حصّہ ہے۔ اس میں سے ان تعمیری اور تعلیمی مدات پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ ان مدات کے لیے اصحاب حیثیت کو اور رقم فراہم کرنی ہوگی۔ اس کا تناسب کیا ہو؟ یہ تناسب ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے خود اہل ثروت طے کریں یا وہ معتمد یا اہل الرائے طے کریں جو عہدِ نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے "عرفا" کی طرح اپنے قبیلے یا اپنی آبادی کی نمائندگی کرتے ہوں۔ خرچ کرنے والوں اور بخل کرنے والوں کو قید و بند اور ضبطی جائیداد جیسی کسی قانونی سزا کی دھمکی نہیں دی گئی، البتہ نتیجے سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ وہی دھمکی ہے۔ تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ بخل کا نتیجہ خود ان کے اپنے حق میں بخل ہوگا۔ اس سے زیادہ بخل کیا ہو سکتا ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں اپنا مستقبل خراب کر لے اور چند ٹکے بچانے کی خاطر عام تباہی اور بربادی مول لے لے۔

یہی تنبیہہ اور آگاہی دوسرے موقع پر مختصر انداز میں دی گئی ہے۔ "راہ خدا میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو" (سورۂ بقرہ ۲، آیت ۱۹۴)

حکومتِ اسلامیہ کے دفاعی مصارف
اور
ذرائع آمدنی

ممکن ہے اس کو دراز نفسی سمجھا جائے، مگر حقیقت یہی ہے کہ قرآنِ حکیم نے اُمتِ اسلامیہ کے جو فرائض تجویز کیے ہیں مُسلمان ان سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جب پُوری دُنیا کی قیادت اور بین الاقوامی لیڈرشپ مُسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اسی لیے قرآنِ حکیم نے صرف اتنی طاقت کو کافی نہیں سمجھا جو مُلک کی حفاظت کر سکے، بلکہ حکم یہ ہے:

"جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمن کے مقابلہ کے لیے ایسا ساز و سامان مہیا کیے رکھو کہ اللہ تعالٰے کے دُشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔ (سورۂ انفال ۸ آیت ۵۹)

"تمام دُنیا کی قیادت مُسلمانوں کے لیے اجنبی بات نہیں ہے۔ کم و بیش ایک ہزار سال تک مُسلمانوں کو یہ منصب حاصل رہا ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں مشہور مؤرخ ابنِ خلدون نے تنبیہہ کی تھی کہ پرتگیز بھی اپنی طاقت بڑھا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مُسلمانوں کے مقابلہ پر آجائیں۔" (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۵۲ قیادۃ الاساطیل)

بہرحال تمام دُنیا کی قیادت عامہ سنبھالنے کے لیے جس طاقت کی بھی ضرورت ہے اس کے لیے دولت کہاں سے آئے گی؟

کسی خوش فہم کو مطمئن نہ ہونا چاہیے کہ ترقیاتی منصوبوں یا دفاعی استحکام کے مصارف ملک کے غیر مسلم باشندوں سے وصول کیے جائیں گے۔ قرآنِ حکیم اس ناانصافی کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآنِ حکیم خصوصیت سے مسلمانوں کو مخاطب کرکے ہدایت دے رہا ہے:

"مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اُٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہوکر زمین پکڑ لیتے ہیں۔
کیا آخرت چھوڑ کر دُنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو (اگر ایسا ہی ہے) تو (یاد رکھو) دُنیاوی زندگی کی پونجی آخرت کے مقابلہ میں اگر کچھ وجود رکھتی ہے تو وہ بہت ہی تھوڑا ہے (نفی کے برابر) (اور دیکھو) اگر تم قدم نہیں اٹھاتے تو یاد رکھو وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈال دے گا جو دردناک ہوگا اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لاکر کھڑا کردے گا۔ اور تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے اپنا ہی نقصان کروگے۔
(سورہ توبہ ۹، آیت ۳۸ و ۳۹)

پھر ارشاد ہے:

"نکل کھڑے ہو (قدم بڑھاؤ) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں۔ اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر تم میں سمجھ ہے۔ (سورہ توبہ ۹، آیت ۴۰)

یعنی صرف جانیں قربان کرنا نہیں، بلکہ مال قربان کرنا بھی مسلمانوں پر فرض ہے اور ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ عقیدہ رکھے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ:

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں بس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں"۔

(سورۂ توبہ ۹، آیت ۱۱۱)

جب مسلمان کا مال خدا کا مال ہے، تو اگر دفاعی اور جنگی استحکام کے لیے پورا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوئی تو مسلمان پر فرض ہو گا کہ پورا مال خرچ کر دے۔ اے پیغمبر! تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجیے جو افزود ہو۔ (سورہ بقرہ ۲، آیت ۲۱۸)

اس کی وضاحت یہ ہے :

"مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری تجارت جس میں گھاٹا پڑ جانے سے ڈرتے ہو۔ تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ اگر یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ راہ نہیں دیتا فاسقوں (نافرمان لوگوں کو) (سورہ توبہ ۹، آیت ۲۲)

بہرحال ایک طرف مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ :

جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا۔ اور یاد کرو اللہ کو بہت سا اور توقع رکھو کہ تم کامیاب ہو گے (سورہ جمعہ)

یعنی فریضہ نماز اپنے وقت پر ادا کرو۔ پھر کاروبار میں مصروف ہو کر منافع حاصل کرو تو دوسری طرف یہ ہدایت ہے کہ جو کچھ منافع حاصل کرو اس کو اللہ کا فضل و انعام سمجھو اور یقین رکھو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ملت کا ہے اور جب بھی ضرورت پیش آئے

اس کو قربان کر دو۔ تو جس ملت کا یہ دستور العمل ہو گا تو کیا کبھی اس کا کوئی منصوبہ کسی دوسرے کا دست نگر رہ سکے گا۔

بہر حال مذکورہ بالا آیات نے جس طرح ترقیاتی منصوبوں اور غیر معمولی دفاعی استحکام کی ہدایت کی۔ ساتھ ساتھ ذرائع آمد کی وضاحت بھی کر دی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ تمام مصارف کی فراہمی مسلمانوں کے ذمہ ہے وہ خود اپنی آمدنی سے یہ مصارف فراہم کریں گے۔

قرآن حکیم نے ان مصارف کے بارے میں کوئی مطالبہ کسی غیر مسلم سے نہیں کیا۔ بیشک غیر مسلموں سے جزیہ لیا جائے گا، مگر اس کی حیثیت حفاظتی ٹیکس کی ہے اور اس کی مقدار بھی اتنی ہی ہوتی ہے کہ صرف حفاظتی ضرورتوں (مثلاً پولیس) کے لیے کافی ہو سکے۔

اسلامی حکومت، اگر صحیح اصول پر کار فرما ہو، تو اس کو بجا طور پر فخر کرنے کا حق ہو گا۔ وہ غیر مسلموں کو شہری حقوق مسلمانوں کی برابر بلکہ بعض صورتوں میں مسلمانوں سے زیادہ حقوق دیتی ہے مثلاً مسلمان شراب کا کوئی دھندا نہیں کر سکتا نہ کشید کر سکتا ہے نہ خرید یا فروخت کر سکتا ہے اسی طرح مسلمان خنزیر اور بعض ائمہ کے نزدیک، ہاتھی کی تجارت بھی نہیں کر سکتا، مگر غیر مسلموں کو ان کے کاروبار کی اجازت ہوتی ہے۔ ہدایت صرف یہ ہوتی ہے کہ بر سر عام نہ ہو۔ شہری حقوق میں۔ اس فراخ حوصلگی کے باوجود ان پر نہ دفاعی اور جنگی ذمہ داری ہے نہ ترقیاتی منصوبوں کے مطالبات ان پر لازم ہوتے ہیں۔

البتہ کسی غیر مسلم قوم نے جب مسلمانوں کی قیادت تسلیم کی تھی اس وقت، کوئی ایسا معاہدہ کیا تھا جس کی بنا پر دفاع میں شرکت کی ذمہ داری ان پر لازم آتی ہے، تو مسلمانوں پر فرض ہو گا کہ وہ معاہدہ کی ہر دفعہ کی پوری پوری پابندی کریں۔

"وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ"

عہد پورا کرو۔ عہد کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی (بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۳۴)

خلفاء راشدین کی وصیتیں دنیا کے سامنے موجود ہیں وہ وفات کے وقت بھی تاکید کیا کرتے تھے کہ جن سے معاہدہ ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس پناہ میں کوئی رخنہ نہ آئے۔

فرد کی ملکیت تقسیمِ دولت اور تہذیبِ اخلاق

انفرادی ملکیت کو اسلام نے اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ وہ صاحبِ ایمان کو پونجی پتی بنانا چاہتاہے یا سرمایہ داری سے اس کو محبت ہے۔

فرد کی ملکیت کو اسلام نے اس لیے تسلیم کیا ہے کہ انسانیت کا جوہر نکھرے اور شرفِ انسانیت کی وجہ اور انسانی عظمت کی علت، مشاہدہ بن کر سامنے آئے۔

اخلاق کی بلندی، انسانیت کا جوہر ہے۔ اسلام فرد کو اس لیے مالک بناتاہے کہ وہ مکارمِ اخلاق سے آراستہ ہو۔

بخل، خود غرضی، تنگ نظری، حرص، طمع، حسد وہ ذلیل اور کمینہ خصلتیں ہیں جو شرفِ انسانیت سے میل نہیں کھاتیں یہ بہائم اور درندوں کی خصلتیں ہیں۔ دامنِ انسانیت ان گندی خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔ مقدّس مذہب کا پہلا مطالبہ یہ ہوتاہے کہ انسان ان گندی خصلتوں سے تقدس حاصل کرے۔ یہ تقدس اسی صورت میں حاصل ہوسکتاہے کہ فیض رسانی، نفع بخشی، محبت و شفقت، لطف وکرم کے موتی چمکیں اور تاجِ انسانیت کو مرصّع کر دیں ... اپنے زمانہ کا سب سے بڑا پونجی پتی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس نو خانۂ ملکیت کا نوٹس نہیں دیا تھا کیونکہ اس سے نہ کسی بہتر خلق کی تربیت ہوتی تھی اور نہ بُری خصلت کا ازالہ ہوتا تھا۔ صرف ایک جبر و قہر ہونا اور ظلم کی ایک مثال دُنیا کے سامنے آتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس کو یہ نصیحت کی تھی:

اَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (سورۂ قصص ۲۸ آیت ،،)

"جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم، انعام و احسان سے تم کو نوازا ہے تم بھی اسی طرح خلقِ خدا کو احسان و لطف سے نوازو۔"

یعنی دولت کا مفاد یہ ہونا چاہیے کہ احسان انعام و لطف و کرم۔ احسان مندی اور شکر گزاری کی فضا جلوہ گر ہو۔ دولت مند رب ذوالجلال کا شکر گزار ہو اور خلق پر احسان کرے۔ خلق جو اس کے لطف و کرم سے فیضیاب ہو گی وہ اس کی شکر گزار اور احسان مند ہو گی۔ اس طرح انسانی اخوت بال و پر پھیلائے گی اور شجرۂ انسانیت بار آور ہو گا۔

اسلام یہ ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ دولت جس کے معنی ہی "لین دین" ہیں اس کی گردش بند ہو اور چند افراد میں منحصر اور محصور ہو کر رہ جائے۔

اگر آج قارون اور قارون کے خزانہ سے نفرت فطرت انسانی کا جزو بن گئی ہے اور یہودیت کو توہین آمیز طعنہ سمجھا جاتا ہے تو صرف قرآن حکیم ہی ہے جس نے ان کا تعارف کرایا۔ یہاں تک کہ سرمایہ نواز الفاظ توہین کے الفاظ سمجھے جانے لگے۔ اور ان کی تہہ میں سرمایہ داری سے نفرت دلوں میں رچ گئی ہے۔

اسلام دولت کے لیے تقسیم کو لازمی قرار دیتا ہے، البتہ جب تک انسان اپنے ہوش و حواس اور اپنے اختیار میں ہے وہ دولت کی تقسیم خود نہیں کرتا۔ وہ دولت مند سے تقسیم کراتا ہے تاکہ بخل جیسی خصلت کا روگ دولت مند کے دل سے دور ہو البتہ جب انسان موت کا استقبال کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو ختم کر دیتا ہے بالفاظ دیگر زندگی کا ورق لپیٹتے ہوئے جب اس کے اختیارات ختم ہونے لگتے ہیں، تو اسلام آگے بڑھ کر تقسیم دولت کا عمل خود کرتا ہے، البتہ غیروں میں نہیں، بلکہ خود اسی کے عزیز و اقارب میں اس کے پارچے اور قاشیں تقسیم کر دیتا ہے۔

لازمی تقسیم

زندگی میں لازمی تقسیم وہ زکوٰۃ ہے جو دولت مند پر ہر سال اسی طرح لازمی ہوتی ہے کہ جیسے ہی سال کے آخری دن کی شام ہوتی ہے۔ دولت کا یہ حصہ اس کی مِلک سے

نکل کر ضرورت مند کا حق بن جاتا ہے۔ یہ حصّہ اس کا نہیں رہتا اگر اس میں تصرف کرتا ہے تو وہ دوسرے کے حصّہ میں تصرف کر رہا ہے اور اس کی آمیزش سے اپنے پورے مال کو ناپاک کر رہا ہے۔

یہ حصّہ اس کی ملک سے اس درجہ خارج ہو گیا کہ اگر وہ کسی مصلحت یا حماقت سے پورے مال کو دریا میں غرق کر دے یا کسی اور طرح تباہ کر دے، تو زکوٰۃ کا حصّہ اس پر پھر بھی واجب الادا رہے گا۔ کیونکہ یہ حصّہ اس کا نہیں رہا تھا۔ اس حصّہ کو تباہ کر کے اس نے دوسرے کا حق تباہ کیا ہے۔

جذبۂ دولت مندی اور سرمایہ داری کا استیصال

جس کو ہم دولت سمجھتے ہیں ابھی اس کا وجود بھی نہیں ہوتا کہ اسلام دولت مندی کے مطالبات اس پر لازم کر دیتا ہے۔

اگر چوّن تولہ چاندی کسی کے پاس ہے تو عرف اور محاورہ میں اس کو دولتمند نہیں کہا جاتا، مگر اسلام اس کو دولت مند قرار دیتا ہے اور اس پر وہ مطالبہ عائد کر دیتا ہے جو دولت مند پر عائد ہوتا ہے۔ اگر رمضان شریف کی ۳۰ تاریخ کو کسی کے پاس چوّن تولہ چاندی اس کی ضروریات سے فاضل ہے تو اگلی صبح کو جس طرح بڑے مالدار پر صدقۂ فطر واجب ہے اس پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی طرف سے جن کی پرورش اس کے ذمّہ ہے فی کس پونے دو سیر گیہوں یا اتنے گیہوں کی قیمت ضرورت مند کو دے۔

بقر عید کے موقع ایک قربانی واجب ہو جاتی ہے اور جب سال ختم ہو گا تو اس کا چالیسواں حصّہ ادا کرنا ہو گا۔ جیسے جیسے دولت بڑھتی رہے گی زکوٰۃ کی رقم بھی بڑھتی رہے گی۔ مثلاً جب ایک لاکھ کا سرمایہ ہو جائے گا، تو ڈھائی ہزار سالانہ زکوٰۃ کی رقم ادا کرنا ہو گی۔ اب اگر اپنی اس پونجی کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو وہ مجبور ہے کہ تجوری سے نکال کر مارکیٹ میں لائے اور اس سرمایہ میں گردش پیدا کرے، ورنہ تقریباً

پچاس سال میں یہ تمام رقم زکوٰۃ کے راستہ ضرورت مندوں کے پاس پہنچ جائے گی۔

پھر اسلام کی نظر میں سونا چاندی یا مالِ تجارت ہی سرمایہ نہیں ہے، بلکہ وہ مویشی بھی سرمایہ ہیں جو دیہات میں بسنے والوں کے پاس ہوتے ہیں۔ گائے، بیل، بھیڑ، بکری، اُونٹ، بھینس بھینسا ہر ایک جانور سرمایہ ہے اور ایک مخصوص مقدار (جس کو نصاب کہا جاتا ہے) مقرر ہے۔ اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہیں تو وہ ایک نصاب کا مالک ہے اس کو ختم سال پر ایک بکری دینی ہوگی وغیرہ وغیرہ (تفصیلات کتب فقہ میں بیان کی گئی ہیں)

پھر یہ تمام خرچ اور آج کل کی اصلاح میں اپنی دولت کی تقسیم اگر نام و نمود کے لیے ہے یا کسی پر احسان رکھنے یا اپنی کوئی غرض پُوری کرنے کے لیے ہے تو اگرچہ قانونی طور پر اس کا فرض ادا ہو گیا، مگر عند اللہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے اس مٹی میں کاشت کی نیت سے دانے بکھیر دیے جو کسی چٹان پر جم گئی تھی، جیسے ہی بارش کی بُوندیں پڑیں وہ مٹی بہہ گئی ساتھ میں دانے بھی بہہ گئے۔ دُھلی دُھلائی چٹان باقی رہ گئی جہاں نہ کوئی تخم ہے نہ پودا۔ (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۶۴)

اسلامی اور ایمانی نقطۂ نظر سے یہ خرچ اس لیے ہونا چاہیے کہ خود اس کی اپنی اصلاح ہو۔ بخل وغیرہ کی بُری خصلتوں کے بجائے ہمدردیِ خلقِ خدا اور لطف و احسان کی خصلتیں نشو و نما پائیں اور سب سے اہم بات یہ کہ بندہ کا جو تعلق اپنے رب سے ہے وہ مستحکم ہو۔ بارگاہِ رب العزت میں اس کو اطاعت شعار بندہ قرار دیا جا سکے۔

ایک طرف جذبہ سرمایہ داری کی یہ بیخ کنی ہے دوسری طرف خرچ (یا تقسیم دولت) کی یہ اہمیت ہے کہ:

(۱) کسی شخص کو نیک نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں یہ بات نہ ہو کہ مال کی ضرورت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں پر خرچ کرتا رہے۔ مقروضوں کے قرض کی ادائیگی اور غلاموں کی گردن چھڑانے

ہیں مدد کرتا رہے۔ (سورہ بقرہ ۲، آیت ۱۷۷)

(۲) کسی کو عبادت گزار نہیں کہا جا سکتا جب تک نماز کی طرح زکوٰۃ بھی پابندی سے ادا نہ کرے؛ چنانچہ جہاں نماز کا حکم ہے (اَقِیمُوا الصَّلوٰۃ) ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم ہے (اٰتُوا الزَّکوٰۃ)

(۳) وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں جس کا پڑوسی بھوکا رہے اور یہ پیٹ بھر لے (حدیث صحیح)

(۴) صحیح معنی میں پاک باز اور متقی کامل وہ ہے جو اپنا مال اس غرض سے دیتا ہے کہ اس کا دِل پاک ہو جائے اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا بدلہ دے۔ صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی مقصود ہو۔ (سورہ والّلیل ۹۲ آیت ۱۹، ۲۰)

زکوٰۃ کے علاوہ

اگر فاقہ اور افلاس کی وبا ایسی عام ہے کہ زکوٰۃ کی پوری پوری رقم ادا کرنے کے بعد بھی لوگوں کو فاقہ سے نجات نہیں ملتی تو سورہ بلد کی وہ آیتیں صاحبِ دولت کو مضطرب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا (انسان) خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا۔ کہتا ہے میں نے بے شمار دولت خرچ کر ڈالی (میں نے کھپایا مال ڈھیروں) حضرت شاہ عبدالقادر صاحب) کیا یہ (انسان) سمجھتا ہے کہ نہیں دیکھا اس کو کسی نے۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور کیا ہم نے (خیر و شر یا کامیابی و ناکامی) کے دونوں راستے اس کو نہیں بتا دیے۔ پس وہ انسان گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا (دشوار راستہ طے نہ کیا) تمہیں معلوم ہے۔ گھاٹی کیا ہے چھڑانا کسی گردن کا (مقروض کا قرض ادا کرنا۔ غلام کو آزادی دلانا) یا کھلانا بھوک کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی خاک میں لینے والے مسکین کو (محتاج کو)

ان آیتوں میں دولت کی بھی شرط نہیں بلکہ ہر وہ شخص جس کو خدا نے یہ قدرتی دولت دی ہے کہ وہ ہونٹوں اور زبان سے بول سکتا ہے جس کو بینائی کی نعمت حاصل ہے اس پر لازم ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے شکر میں مقروض کا قرض ادا کرے، غلام کو آزادی دلائے، فاقہ زدہ مسکینوں کی امداد کرے اور صرف یہی نہیں کہ اگر اس نے اپنی جانب سے یہ امداد کر دی تو سبکدوش ہو گیا، بلکہ حکم یہ ہے کہ دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرے، یعنی ہمدردی نوع انسان اور غربا پروری کی عام فضا پیدا کرے۔

سورہ ماعون ۱۰۷ کی ابتدائی آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ فرمائیے، اس حکم کا انداز کتنا سخت ہے:

کیا تُو نے نہیں دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے دین کو یہ وہ شخص ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں ترغیب دیتا (دوسروں کو آمادہ نہیں کرتا) مسکین کو کھانا کھلانے پر (سورہ ماعون ۱۰۷)

دین کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے انصاف کیا ہے اور حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحبؒ نے روزِ جزا (قیامت) بہر حال یہ آیتیں تنبیہہ کر رہی ہیں کہ تقاضائے دین صرف یہی نہیں ہے کہ خود خرچ کرے بلکہ تقاضائے دین یہ ہے کہ دوسروں کو بھی آمادہ کرے۔ اگر اس میں سُستی کرتا ہے، تو گویا سلسلہ دین کی تکذیب کرتا ہے۔

سورۂ الحاقہ آیت ۳۰ تا ۳۲ میں اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان آیات میں کافر کے شدید ترین عذاب کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے "مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیا کرتا تھا"۔ اصول فقہ کے لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب فاقہ زدہ لوگوں کی امداد پر دوسروں کو آمادہ نہ کرنا موجبِ عذاب ہے، تو آمادہ کرنا واجب ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ ھُمَزہ اور بہت سی آیتوں کا ترجمہ پہلے ابواب میں گزر چکا ہے۔ یہاں قابلِ توجہ یہ ہے کہ دارالاسلام میں مسکینوں اور ضرورتمندوں کی امداد کا فرض حکومت پر عائد ہوگا اور وہ دولت مندوں کی امداد سے اس فرض کو ادا کرے گی، لیکن جہاں اسلامی نظامِ حکومت نہیں ہے وہاں ہر دولت مند ان آیتوں کا مخاطب ہے۔ نظامِ حکومت نہ ہونے کے عذر سے وہ ان آیتوں کے خطاب سے سبکدوش نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ یہ آیتیں مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی تھیں جب مکہ دارالاسلام نہیں تھا، بلکہ بدترین دارالحرب تھا جہاں مسلمانوں کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا!

ہم نے صرف قرآن شریف کی چند آیتیں پیش کی ہیں۔ احادیث کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے ان کے علاوہ چند حدیثیں اور علماء کرام کے اقوال پیش کیے ہیں جو اہلِ علم کے لیے دلچسپ اور معنی خیز ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

(اسلام کا اقتصادی نظام ص۲۴۶ تا ۲۵۴)

دُوسری ضرورتیں

پہلے گزر چکا ہے کہ صرف یتیموں اور مسکینوں کی امداد ہی ملت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ملت کی اور بھی ضرورتیں ہیں اور بعض ایسی ہیں جو دارالحرب اور دارالکفر میں اور زیادہ اہمیت حاصل کرلیتی ہیں۔ مسلمان کچھ امتیاز رکھتا ہے اسی وجہ سے اس کو مسلمان کہا جاتا ہے اگر کسی ملک میں وہ اپنے اس امتیاز کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے تو اس ملک کا نام کچھ بھی رکھیں اور فقہ کے لحاظ سے آپ اس کو کوئی بھی حیثیت دیں اس ملک میں بود و باش اس کے لیے ناجائز نہیں ہوگی لیکن یہ اس کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے اس امتیاز کو قائم رکھے۔ اس امتیاز کو قائم رکھنے کے لیے اس کو تعلیمی نظام کی بھی ضرورت ہوگی۔ تبلیغ و اصلاح کے حلقے بھی ضروری ہوں گے۔ مدارس، مساجد، مکاتب اور تربیت گاہیں وغیرہ اس کی حیاتِ ملی کے لوازمات ہیں۔ ان کے جملہ لوازمات پر زکوٰۃ اور صدقہ فطر کی رقومات صرف نہیں ہوسکتیں، لہٰذا اہلِ استطاعت کا فرض ہوگا کہ وہ ان ضرورتوں کا جائزہ لیں اور ان کے پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ عطیات فراہم کریں، یعنی قرآنِ حکیم کی اصطلاح کے

بموجب اللہ تعالیٰ کو "قرضِ حسنہ" دیں۔ ان ملّی ضرورتوں سے بے اعتنائی ملّت کی اور اپنی ہلاکت ہے۔ اس ہلاکت سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"راہِ خدا میں خرچ کرو۔ خرچ سے پہلوتہی کر کے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اور نیکی کرو، یقیناً اللہ تعالےٰ کی محبت انہی کے لیے ہے جو نیکی کرنے والے ہیں (بقرہ ۲ آیت ۱۹۴)

اس سلسلہ میں سورہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی آخری آیتوں کا ترجمہ مصارف اور ذرائع آمدنی کے باب میں پہلے گزر چکا ہے۔ قرض فی سبیل اللہ پر پہلے ابواب میں بحث ہو چکی ہے۔ وہ قابلِ مراجعت ہے۔

لازمی تقسیم کی دُوسری صُورت

ترکہ کی تقسیم

جب ایک مُسلمان اس دارِ فانی سے رختِ سفر باندھنے لگتا ہے اور وقت آتا ہے کہ چار و ناچار اپنے تمام مقبوضات دوسرے کے حوالے کرے تو وہ ملکیت جس کی حقیقت عاریت تھی اس کا چولہ خود بخود اُتر جاتا ہے۔ زندگی میں اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ یہ تقسیم کرے اور اخلاقی کمالات پیدا کرے۔ اب مالک حقیقی خود تقسیم کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ صرف ایک تہائی تک اس کو اجازت دی جاتی ہے کہ اپنی صوابدید کے بموجب خرچ کرے باقی تمام ترکہ میں وہ تقسیم جاری ہوتی ہے جو مالکِ حقیقی نے اس پختگی کے ساتھ طے کر دی ہے کہ کسی کو لب کشائی کی اجازت بھی نہیں ہے؛ چنانچہ واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

"دیکھو، تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی، تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ نزدیک ہے (اور کس کا حق زیادہ ہونا چاہیے اور کس کا کم) اللہ تعالیٰ کی

حکمت ہی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے بس۔ اللہ تعالیٰ نے حصّے ٹھہرا دیے ہیں اور وہ (اپنے بندوں کی مصلحت کا) جاننے والا (اور اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے۔ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۱۱)

(یاد رکھو) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیاں ہیں جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو اللہ اسے (ابدی راحتوں کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہے گا اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے جو اسے حاصل ہوگی، لیکن جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں سے تجاوز کیا تو (یاد رکھو) اس کو آگ کے عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ ایسی حالت میں رہے گا اور اس کو رُسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۱۳ و ۱۴)

بیت المال اور مداخل و مصارف

سمجھانے کے لیے "قومی فنڈ" یا "اسٹیٹ" کا لفظ بھی بولا جاسکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مبہم الفاظ بیت المال کا پُورا مفہوم ادا نہیں کرتے۔

لفظی معنی کے لحاظ سے اگرچہ بیت المال (مال کا کمرہ) اس مکان کا نام ہے جہاں خلافت اسلامی کا مرکزی خزانہ محفوظ رہتا ہو، مگر محاورہ میں اسلامی حکومت کے پورے مالی نظام کو بھی "بیت المال" کہہ دیا جاتا ہے۔ یہی عام مفہوم اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے اور اسی کی آمدنی اور خرچ کے مدّات بیان کرنے مقصود ہیں:

(۱) زکوٰۃ (۲) صدقۂ فطر (۳) عشر۔ یہ تینوں مد مُسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ صرف مسلمانوں سے وصول کیے جائیں گے۔ (غیر مُسلم اگر چاہیں تو وہ بھی اس طرح کا نظام قائم کر سکتے ہیں اسلامی حکومت انہیں مجبور نہیں کرے گی) یتیم بچے، ضرورت مند مسلمان مَرد اور عورتیں جو صاحبِ نصاب نہ ہوں. ضرورت مند مسافر (ابن السبیل) ان کے مصارف ہیں مسلمان طلبہ کے تعلیمی وظیفے بھی ان مدات سے دیلے جاسکتے ہیں۔

(۴) اوقاف ــ ہر ایک وقف کی آمدنی کا مصرف وہ ہو گا جو وقف نامہ میں درج ہے۔ وہ مصرف نہ رہا ہو یا غلط قرار دے دیا گیا ہو تو یہ آمدنی بیت المال کے ذریعہ قریب تر یا مناسب تر مد میں صَرف کی جائے گی۔

(۵) خراج۔ وہ مال گزاری (محصول) ہے جو غیر عشری زمینوں سے لیا جاتا ہے۔ کُتب فقہ میں عشری اور خراجی زمینوں کی تفصیلات درج ہیں۔ مجاہدِ ملّت نے بھی "اسلام کے اقتصادی نظام" میں ان کی تفصیل کردی ہے، مراجعت کی جائے۔

(۶) عشور سمجھانے کے لیے درآمد برآمد کی ڈیوٹی (کسٹم ڈیوٹی) کہا جاسکتا

ہے، مگر عشور اور کسٹم ڈیوٹی میں بڑا فرق ہے۔ عشور صرف تجارتی مال پر لیا جاتا ہے ملک کے اندر نہیں لیا جاتا، بلکہ دوسرے ملک سے درآمد و برآمد پر لیا جاتا ہے۔

نصاب کی جو مقدار ہے یعنی چوّن تولہ چاندی اس سے کم قیمت کے مال پر نہیں لیا جاتا بعض صورتوں میں مقروض سے نہیں لیا جاتا۔ مسلمان اگر زکوٰۃ ادا کر چکا ہے تو اس سے نہیں لیا جاتا۔ غیر ملکی سے اس وقت لیا جاتا ہے جبکہ دوسرا ملک جس سے درآمد یا برآمد ہو رہی ہے، وہ بھی لیتا ہو، ورنہ نہیں لیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس عشور کو جس کا دوسرا نام مکس بھی ہے پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے "لا یدخل الجنّۃ صاحب مکس" مکس وصول کرنے والے کو جنّت نصیب نہ ہوگی۔ (ابوداؤد)

حدیث ماعز میں ہے (لقد تاب توبۃ لو تابہا صاحب مکس) الحدیث۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ تعاون باہمی کے اصول پر آزادانہ اور کھلی تجارت جاری رہے۔ خدا کے بندے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ایک ملک اور ایک قوم کے ہوں یا ان کے ملک اور ان کی قومیں مختلف ہوں ایک دوسرے کے لیے سہولتیں فراہم کریں۔ ایک دوسرے کو نفع پہنچائیں باہمی روابط اور تعلقات بڑھیں تاکہ انسانی اخوّت جلوہ گر ہو۔ لہٰذا اسلامی مملکت اپنی طرف سے کوئی ٹیکس نہیں لگائے گی، البتّہ دوسرا ملک ٹیکس وصول کرتا ہے، تو قانون اسلامی (فقہ) کا اصول یہ بھی ہے کہ نقصان کا سدِّباب کیا جائے۔ "الضرر یزال" اس حد تک کہ اسلامی مملکت نقصان نہ اٹھائے ٹیکس لگایا جائے گا لیکن ایک مسلمان حاکم کو اس کے وصول کرنے میں کس درجہ احتیاط برتنی چاہیے۔ صاحبِ شریعت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مذکورہ بالا ارشادِ گرامی، اس کو تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر وہ بھی عام انسپکٹروں کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور اپنی کسی قسم کی بے اعتدالی سے اس تعاون باہمی کے سلسلہ (بین الاقوامی تجارت) کو متاثر کرتا ہے تو دوزخ کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے وہ جنّت میں نہیں نہیں جائے گا۔ (واللہ اعلم)

شرح : عشر ("عشر" سے ماخوذ ہے (دسواں حصہ) پس غیر ملکی غیر مُسلم سے دس فیصدی دارالاسلام کے غیر مُسلم سے پانچ فیصدی اور مسلمان سے ڈھائی فیصدی کیونکہ غیر مُسلم سے وہ ملکی ہو یا غیر مُلکی صرف اس مال کا ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کو وہ درآمد یا برآمد کر رہا ہے۔ اس کی دکان پر یا گودام میں جو مال ہے یا اس کے گھر میں جو زیور یا نقد کی شکل میں سونا چاندی ہے، اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور مسلمان کے تمام مال بلکہ تمام اثاثہ پر زکوٰۃ واجب ہے۔ وہ دکان میں ہو یا گودام میں یا مکان میں نقد کی شکل میں یا زیور وغیرہ کی شکل میں، بس مسلمان سے اس درآمدی در آمدی اور برآمدی مال میں اگرچہ ڈھائی فیصد وصول کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کو کل مال پر اس نسبت سے ادا کرنا ہوتا ہے تو اس کا اوسط غیر مُسلم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غیر مُسلم کا کل اثاثہ اگر ایک لاکھ ہے اور اس نے دو ہزار کا مال درآمد یا برآمد کیا ہے تو اگر غیر مُلکی ہے تو اس سے دو سو روپے اور مُلکی ہے تو اس سے سو روپے اور مُسلمان ہے تو اس سے پچاس روپے لیے گئے، لیکن چونکہ مُسلمان کو کل اثاثہ (ایک لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی تو بیت المال کو اس سے سال میں صرف پچاس روپے نہیں بلکہ ڈھائی ہزار روپے وصول ہوں گے۔ جبکہ غیر مُسلم سے صرف سو یا دو سو وصول ہُوئے تھے۔

علاوہ ازیں غیر مُسلم غیر ملکی سے دس فیصدی اس وقت ہے جبکہ وہ بھی اسی نسبت سے وصول کرتے ہوں اور اگر وہ اس سے کم وصول کرتے ہیں، تو دارالاسلام کے انسپکٹر بھی اس سے کم ہی وصول کریں گے لانّا احق بالمکارم۔

(یعنی دارالاسلام والوں پر زیادہ ضروری ہے کہ ان کے اخلاق بہتر اور بلند تر ہوں) ۔ مزید تفصیلات کتبِ فقہ میں ملاحظہ ہوں۔

(۷) جزیہ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا۔ وہاں کے یہودیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ بالآخر ایک معاہدہ کر لیا۔

"حکومتِ اسلام کو حق ہوگا کہ جب ضرورت سمجھے خیبر کو یہودیوں سے خالی کرالے، مگر جب تک وہ رہیں گے وہ اراضی پر بدستور قابض رہیں گے، البتہ پیداوار کا نصف حصہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔" جب تک یہودی خیبر میں رہے اسی معاہدہ پر عمل ہوتا رہا۔ طے شدہ حصے کے علاوہ ان سے نہ خراج لیا گیا نہ جزیہ (المبسوط للسرخسی، ص ۲، ۳ ۔ ج ۲۳)

اسی طرح کسی بھی مرحلہ پر کسی قوم یا کسی آبادی سے کوئی معاہدہ ہو جاتا ہے تو قرآنِ حکیم کا حکم ہے: "اوفو بالعقود" ان معاہدات کو پورا کرو۔ (سورہ مائدہ)

"اوفو بالعہد" عہد کو پورا کرو۔ (بنی اسرائیل)

اس طرح کے معاہدے طرفین کی صوابدید پر اور مفتوح قوم کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہوں گے۔ (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۸۰، ہم تا ۹۱ ہم ص ۱۸۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دورِ مسعود میں جو معاہدے ہوئے، وہ تاریخ طبری فتوح البلدان بلاذری سیر کبیر (امام محمد) مبسوط (شمس الائمہ سرخسی) وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

ان معاہدات کی شرطیں مختلف تھیں، البتہ ایک بات سب میں مشترک تھی کہ فاتح اور حکمران جماعت سے زیادہ مفتوح اور مغلوب قوموں کی سہولت کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ پھر معاہدہ پر عمل اس احتیاط سے ہوتا تھا کہ خیبر کے یہودی جو مسلمانوں سے بہت گہری پرخاش رکھتے تھے (یہاں تک کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں ایک مرتبہ ایک عورت کے ذریعے زہر بھی دلوا دیا تھا) جب انہوں نے اس احتیاط کا مشاہدہ کیا جو معاہدہ پر عملدرآمد کے سلسلہ میں مسلمان افسر (شہید مؤتہ سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ) نے برتی تھی تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا "بھٰذا قامت السمٰوٰت والارض" انصاف ہی ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں۔"

(فتوح البلدان ص ۴۱ کتاب الاموال ص ۴۸۲ فقرہ ۱۴۳۷)

سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَور میں حمص فتح ہُوا وہاں کے عیسائی باشندوں سے معاہدہ ہوا۔ معاہدہ کے مطابق خراج لیا گیا، لیکن پھر ہرقل (شہنشاہ رومۃ الکبریٰ) کی فوجوں کا دباؤ بڑھ گیا اور مسلمانوں کو عارضی طور پر حمص سے ہٹنا پڑا تو جو خراج وصول کیا تھا وہ واپس کر دیا کہ

قد شغلنا عن نصرتکم والدفع عنکم فانتم علیٰ امرکم (فتوح البلدان ص۱۴۳)

ترجمہ: اب ہم دُشمن کے مقابلہ میں مصروف ہوں گے تمہاری امداد اور تمہارا دفاع نہیں کر سکیں گے۔ آپ لوگوں کو اپنا انتظام خود کرنا ہوگا۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ ۱۳۸ و ۱۳۹ (فصل فی الکنائس والبیع والصلبان)

(۲)

لیکن اگر کوئی معاہدہ نہیں ہُوا مگر یہ مفتوح افراد حکومت سے تعاون کرتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ کے موقع پر اپنی فوج بنا کر کسی مُسلمان جرنیل کی زیرِ قیادت مسلمانوں کی جنگی مہم میں شریک ہوتے ہیں تو "**خُمس**" کا حق جو مسلمان مجاہدین کو ملتا ہے۔ پُورا پُورا ان کو بھی ملے گا۔ (شرح سیر الکبیر للامام محمدؒ ص۳۰۹)

اور اگر مسلمانوں کی فوج میں شریک ہو کر جنگی خدمات انجام دیتے ہیں تو "خمس" کا پُورا حصّہ تو نہیں البتہ ان کی خدمات کے پیشِ نظر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان کو مناسب حصہ دیا جائے گا۔ (حوالہ مذکور و مبسوط وغیرہ)

لیکن اگر اس طرح کا تعاون نہیں کرتے بلکہ اگر ان کو مجاہدین کے ساتھ بھیجا جائے تو اندیشہ ہے کہ ان کی شرکت خطرناک ہوگی۔ اس بنا پر مُلکی دفاع اور تحفّظ کی پوری ذمہ داری مسلمانوں ہی کو برداشت کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں ان پر جزیہ لازم ہوتا ہے۔ حضرات فقہا نے تصریح کر دی ہے کہ دولت سمیٹنا جزیہ کا مقصد نہیں ہوتا بلکہ محض جزوی تدارک اس کا مقصد ہوتا ہے۔

بیشک یہ ایک امتیازی ٹیکس ہوتا ہے جو مُسلمانوں پر نہیں ہوتا صرف غیر مسلموں

پر ہوتا ہے اور چونکہ ایک مذہبی حکومت کی طرف سے ہوتا ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مذہب کی طرف متوجہ ہوں مسلمانوں کے طریقوں کو پرکھیں اور ان کے ذہن مطمئن ہوں تو یہ مذہب قبول کریں۔ (المبسوط ج ۱۰، ص۷۸)

مگر جہاں تک مالی مفاد کا تعلق ہے تو جزیہ کو ان مالی ذمہ داریوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی جو مسلمانوں پر عاید ہوتی ہیں۔

(۳)

قرآنِ پاک کی تصریحات کے بموجب مسلمان "حزب اللہ" اور انصار اللہ" ہیں۔ ان کی جانیں اور تمام مال خدا کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں (سورہ توبہ)

جہاد ان پر فرض ہے۔ دفاع ان پر فرض ہے، لہٰذا ان کو جان بھی قربان کرنی ہے اور مال بھی۔ یہ قربانی ان کے ذمہ نہیں ہے جن سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دورِ مسعود میں رمضان ۸ھ میں مکّہ پر فوج کشی ہوئی۔ حنین اور طائف کے غزوات پیش آئے۔ ان سے چند ماہ پہلے غزوہ موتہ اور چند ماہ بعد رجب ۹ھ میں غزوہ تبوک ہوا۔ ان تمام غزوات خصوصاً تبوک کی مہم کے وقت حالات نہایت نازک تھے۔ مہم اتنی بڑی کہ تیس ہزار مجاہدین نے شرکت کی (جس کی نظیر اس وقت تک اسلامی تاریخ میں نہیں تھی) ایک ماہ کی مسافت کا سفر طے کرنا پڑا۔ بیت المال کا اس وقت تک وجود ہی نہیں تھا۔ ایک طرف فصل تیار دوسری طرف مسلمانوں کے ہاتھ خالی۔ اس تنگدستی کے باوجود تمام خرچ مسلمانوں نے برداشت کیا۔ ان تینوں معرکوں سے پہلے خیبر فتح ہو چکا تھا، جہاں کے یہودی کافی مالدار تھے مگر ان معرکوں کے نام پر کوئی ٹیکس تو کیا لگایا جاتا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کسی یہودی یا عیسائی سے اپیل بھی نہیں کی۔ صرف مسلمانوں سے چندہ کیا اور مسلمانوں نے حیثیت سے بڑھ کر چندہ دیا اور صرف مسلمانوں ہی نے ان تمام مہموں میں شرکت بھی کی، کیونکہ یہی تھے جو رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے خدا کے ہاتھ اپنے آپ کو بیع کر چکے تھے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ الخ (سورہ بقرہ ۲۵ آیت ۲۰۷)

(۴)

جہاد کے مصارف تو درکنار جزیہ کی وہ نسبت بھی نہیں جو زکوٰۃ کی ہوتی ہے۔

جس کے پاس دس ہزار درہم (تقریباً تین ہزار روپے) ہوں اس کو ۴۸ درہم (تقریباً بارہ روپے) سالانہ ادا کرنے ہوں گے جو جزیہ کی سب سے بڑی مقدار ہے۔ (درمختار)

دس ہزار درہم سے زیادہ کتنی ہی دولت اس کے پاس ہو، مگر اس کو سالانہ ۴۸ درہم ہی ادا کرنا ہوں گے، لیکن مسلمان کو دس ہزار پر ڈھائی سو، بیس ہزار پر پانچ سو، چالیس ہزار پر ایک ہزار ادا کرنے ہوں گے اور جس قدر دولت بڑھتی رہے گی اسی تناسب سے زکوٰۃ بڑھتی رہے گی۔

(۵)

زکوٰۃ، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، نابینا، اپاہج، بیمار، تندرست، تارک دُنیا یا دُنیادار، ہر مُسلمان پر فرض ہے۔ صرف نصاب کا مالک ہونا اور سال گزرنا شرط ہے، مگر جزیہ ان میں سے کسی پر لازم نہیں ہوتا۔

جزیہ چونکہ اس نصرت اور اعانت کا تدارک قرار دیا گیا ہے جو بسلسلہ دفاع اس شخص سے مِل سکتی ہے، لہٰذا انہی پر لازم ہوتا ہے جو اپنے بدن سے نصرت اور مدد کر سکتے تھے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے معذور چونکہ جسمانی طور پر جنگ میں کوئی مدد نہیں کر سکتے، لہٰذا ان پر جزیہ بھی لازم نہیں ہوتا۔ سیاسیات سے کنارہ کش، تارکِ دُنیا، سادھو یا راہب وغیرہ بھی جزیہ سے مستثنیٰ رہیں گے۔ متوسط درجہ کے لوگوں کا جزیہ اس سے نصف ہوگا یعنی ۲۴ درہم سالانہ (تقریباً چھ روپے) اور معمولی درجہ کے لوگوں پر صرف ۱۲ درہم[1] سالانہ (تقریباً تین روپیہ) (کتاب الخراج لابی یوسف ص۱۲۲)

---

[1] بارہ درہم کے بھی صرف دس درہم رہ جائیں گے اگر وہ چاندی کے بجائے سونے کے (دینار) کی شکل میں ادا کرے گا (بخاری ص۴۴۶)

شیخ ابن ہمام رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ ایک دینار دس درہم کا ہوتا ہے، مگر جزیہ کے سلسلہ میں بارہ درہم کا مانا جائے گا۔ یہ ہے حکومت کی سیر چشمی اور اہلِ ملک کے حق میں رعایت۔

بہرحال بیت المال کی آمدنی کا ایک مدیہ بھی ہے جس کو جزیہ کہا جاتا ہے۔

(۸) اموال فاضلہ

معینہ مدات کے علاوہ بیت المال کی متفرق آمدنی کو اموال فاضلہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی لاوارث مرا۔ اس کا ترکہ یا بجرم بغاوت کسی کا مال ضبط کیا گیا تو اس کا یہ مال بمد اموال فاضلہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

(۹) خمس

اسلام نے جہاں مذہبی معاملات کی اصلاح کی، جہاد کو بھی مذہب اور دین کا ایک جُزء بنا دیا اور اس کے قاعدوں اور ضابطوں میں بھی اصلاحات کیں۔ جہاد کا مقصد معین کیا کہ:

"راہ خدا میں خدا کے لیے یعنی حق کا بول بالا کرنے کے لیے آپ کو قربان کر دینا"۔

جب یہ مقصد ہے تو ایک مجاہد جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ خدا کا ہے۔ اس کا نہیں ہے۔ اس کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کو اس نظام کے حوالے کر دینا چاہیے جو اس لیے کارفرما ہے کہ خدا کا حکم اور اس کا مقرر کردہ قانون نافذ کرے۔

جاہلیت کے دورِ قدیم میں نہیں، بلکہ تہذیبِ جدید کے موجودہ دور میں بھی فوج کے سپاہی اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد مانے جاتے ہیں وہ صرف شہر ہی فتح نہیں کرتے بلکہ شہری آبادی کی انفرادی ملکیتیں حتیٰ کہ اس کی عصمت اور آبرو بھی فتح کر لیتے ہیں۔ موقع مل جاتا ہے تو ان کی دست درازی خود اپنے شہریوں کو بھی معاف نہیں کرتی۔ بیسویں صدی کی لڑائیوں کے بے شمار مشاہدات اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

لیکن اسلام نے جب جہاد کو مذہبی فریضہ قرار دیا تو وہ تمام اخلاقی پابندیاں بھی لازم کر دیں جن کا مذہب مُعلِّم اور داعی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مجاہد فی سبیل اللہ، اور "ایثار شیوہ" (قربان ہونے والا) شریف و با اخلاق مرد مومن۔ ایک ہی مفہوم کی دو تعبیریں ہیں۔

خیانت بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن اگر مجاہد خیانت کرتا ہے تو گویا ایک حاجی حج کا

احرام باندھ کر حرم کعبہ میں چوری کرتا ہے۔ یہ شرمناک بھی ہے اور موجب عتاب بھی۔

"میدانِ جنگ گرم تھا۔ ایک مجاہد عین معرکہ میں جاں بحق ہو گیا۔ لوگوں نے کہا، درجۂ شہادت حاصل کر لیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، خدا کی قسم غلط ہے۔ مَیں نے دیکھا ہے یہ عذاب میں مبتلا ہے۔ ایک عبا جو اس نے چھپا کر رکھ لیا تھا وہ آتشیں پیرہن بنا ہُوا ہے۔ اس شعلہ اس کے اُوپر بھڑک رہے ہیں۔" (او کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم)

لوگوں نے اس کا سامان دیکھا تو ایک عبا برآمد ہُوا جو اس نے غنیمت میں حاصل کیا تھا اور جمع کرنے کے بجائے خود اپنے پاس رکھ لیا تھا (صحاح)

بقدرِ ضرورت کوئی خوردنی چیز تو اس کے لیے مباح ہے، ورنہ علاقہ جنگ میں جو کچھ اس کے ہاتھ لگتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ خزانے میں جمع کرا دے۔ اگر اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اپنے جہاد کو رائیگاں اور اکارت کر رہا ہے اور عذابِ جہنّم اپنے سر لے رہا ہے۔

جو کچھ غنیمت میں جمع ہوگا، اس کے چار حصّے مجاہدین پر تقسیم کر دیے جائیں گے اور پانچواں حصّہ "بیت المال" میں جمع کیا جائے گا۔ اُس کو "خمس" کہا جاتا ہے۔ جو عنوان مضمون کا معنون ہے۔ جو علاقہ فتح ہوگا اگر اس کے متعلق محارب قوم سے کوئی معاہدہ نہیں ہُوا ہے تو وہ بھی تقسیم کیا جائے گا۔ جس کی تفصیل "توسیع بیت المال" کے تحت میں آگے آئے گی۔ (انشاء اللہ)

حکومت کو حق ہے کہ کانوں کا انتظام خود کرے۔ اس صورت میں جملہ برآمدات "بیت المال" کی ہوں گی، لیکن اگر سونے، چاندی، تانبا، پیتل، لوہے یا رانگ کی کان کسی شخص یا کمپنی کو دے دی گئی ہے تو ان کی پیداوار میں بھی خُمس ہوگا، یعنی زکوٰۃ کی طرح چالیسواں حصّہ نہیں بلکہ جو برآمد ہوگا اس کا پانچواں حصّہ بیت المال کو دیا جائے گا۔ سمندر سے موتی یا عنبر برآمد کیا جائے تو امام ابو حنیفہؒ تو اس کو مچھلی کی طرح برآمد کرنے والے کی ملک قرار دیتے ہیں اور اس پر خمس لازم نہیں کرتے، مگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس میں بھی خمس لازم کرتے ہیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف صـ۲۱ و صـ۲۲)

توسیع بیت المال

یہ عنوان ایجاد بندہ ہے مگر جو مدات ذکر کیے ہیں وہ بیت المال کے مسلمہ مدات ہیں ان کی تشریح آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو اس عنوان کی موزونیت کے متعلق آپ خود فیصلہ کر سکیں گے۔

اگر کسی قدیم مفہوم کو سمجھانے کے لیے کسی جدید اصطلاح کا استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے تو "توسیع بیت المال" کے لیے قومیانے یا قومی ملکیت میں دے دینے کی اصطلاح ممنوع نہیں ہونی چاہیے۔

ماخذ

فَیٔ مفتوحہ علاقے کو بھی کہا جاتا ہے اور اس علاقے کی آمدنی پر بھی "فے" کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص۱۶)

سورۂ حشر میں فَیٔ کے مصارف بیان فرمائے ہیں۔ فقراء مساکین ابن سبیل (وغیرہ) اور اس تقسیم اور صَرف کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (سورہ حشر)

"کہ تم میں سے جو دولت مند اور غنی ہیں۔ ان کے درمیان دُولۃ نہ ہو جائے"

دُولۃ کے معنیٰ "لینے دینے" کے بھی ہیں اور دُولۃ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کو لیا دیا جاتا ہے۔"

بس اس آیت کے معنی یہ کیے گئے ہیں۔

"تاکہ وہ تمہارے تونگروں کے قبضہ میں نہ آجائے۔

(بیان القرآن مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

مختصر یہ کہ یہ آیت ایک بنیادی اصول کی تعلیم ہے کہ جو چیز ایسی ہے کہ اس کا نفع عام ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی منفعت چند افراد کے اندر منحصر ہو کر رہ جائے (آجکل کی اصطلاح میں پیداوار اور ذرائع پیداوار چند افراد کے اندر محدود نہ رہنے چاہئیں اس کے لیے اسلامی

حکومت کا فرض ہوگا کہ جب بھی ایسی صورت پیدا ہو یا پیدا ہونے کا قوی امکان ہو وہ مداخلت کرکے ایسا راستہ نکال دے کہ اس کا نفع دائر سائر رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے بہت سے ارشادات اور فیصلے اس کی تشریح کرتے ہیں۔ حضرات آئمہ مجتہدین اور فقہاء کرام نے اس اصول کے ماتحت بہت سے احکام مرتب فرمائے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

ہمارے پیش نظر تفصیل نہیں ہے ہم صرف نظریات پیش کر رہے ہیں، یہاں چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن کے ذریعے اس اصول کی بھی وضاحت ہوگی اور عنوان کا تقاضا بھی پورا ہوگا۔ (واللہ الموفق وھو المعین)

تفصیل اس لیے بھی بے سود ہے کہ حکومت اسلامیہ کی مجلس شوریٰ کو حق حاصل ہے کہ بیت المال سے متعلق جزوی مدات میں مسلّمہ اصول کے تحت حالات اور وقت کے تقاضے کے بموجب جب ضرورت سمجھے ترمیم کرلے۔

(۱)

مَارِب۔ یَمَن کا مشہور مقام ہے جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں بھی ہے۔ یہیں کے رہنے والے ایک صحابی "ابیض بن حمال سبائی" تھے ان ابیض بن حمال مآربی بھی کہا جاتا ہے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوئے کہ مآرب میں جو نمک ہے وہ ان کو عطا کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست منظور فرمالی۔ جب یہ واپس ہوگئے تو ایک صاحب نے عرض کیا، یارسول اللہ، آپ نے خیال نہیں فرمایا۔ آپ نے ان کو کیا عطا کر دیا۔ آپ نے ان کو "ماءِ عِدّ" یعنی چشمہ عطا فرما دیا۔ جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ آپ نے اس کو واپس لے لیا۔

(ترمذی شریف ص۱۶۶ باب ماجاء فی القطائع آخر کتاب الاحکام و مجمع البحار)

علماء کرام نے اس واقعہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے جو درخواست کی تھی کہ "الملح" (نمک) عطا کر دیا جائے تو اس کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ اس جگہ سے نمک محنت

مشقت اور کسی خاص ترکیب (عمل وکد (لمعات شرح مشکوٰۃ) سے برآمد کیا جاتا ہوگا۔
اسی بنا پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اجازت دے دی۔ اس کی مثال ایسی ہوئی جیسے کسی
جنگل سے درخت کاٹنے کی اجازت دے دی جائے یا لوہے کی کان سے ان ڈھیلوں یا
پتھروں کے نکالنے کی اجازت دے دی جائے۔ جن میں سے خاص ذرّات نکال کر لوہا
بنایا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ "الملح" اس طرح کی کان نہیں بلکہ چشمہ ہے۔ اور
چشمہ بھی موسمی نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ پانی جو خود بخود نمک بن جاتا ہے، ہمیشہ رہتا ہے۔
(الدائم لا انقطاع لمادتہ۔ مجمع البحار)

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا پانی کے چشمہ کی تملیک یا تخصیص جائز ہے اور اس کو
بطور جاگیر کسی کو دیا جاسکتا ہے؟

(۲) کیا ایسی قدرتی چیز جو مباح عام ہو اور اس کی ضرورت بھی عام ہو اس کو کسی
فرد یا افراد کے لیے مخصوص کر دینا اور ان کی ملک بنا دینا درست ہے؟

جہاں تک پانی کا تعلق ہے خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کے متعلق اعلان فرما
چکے تھے الناس شرکاء فی ثلاث الماء والکلاء والنار۔

(کتاب الاموال لابی عبید ص۲۹۵ فقرہ ۷۲۸)

تین چیزوں میں تمام انسانوں کا مساویانہ ساجھا ہے۔ پانی۔ گھاس۔ آگ۔
(لپٹ، اور روشنی یا اس کی تپش۔ باقی چنگاری جس کا کوئلہ بنتا ہے وہ اس کی
ہے جس کی لکڑی ہے)۔

دوسری بات کہ یہ قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے اور اس کو بنانے کے لیے محنت، مشقت نہیں
کرنی پڑتی تو اس کا جواب بھی اسی ارشاد سے معلوم ہوگیا کہ خودرَو گھاس کی طرح یہ عام
ہونی چاہیئے، بہرحال آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ عطیہ خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے
مقرر کردہ اصول کے خلاف تھا، لہٰذا آپ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔

فقہاء کرام نے اس چشمہ جیسے "معدن" کے لیے معدن ظاہر کی اصطلاح مقرر کی اور
ضابطہ طے کر دیا کہ:

"وہ زمین جہاں سے نمک خود بخود برآمد ہوتا ہے، جہاں سے تارکول یا تیل خود بخود بہتا ہے اور اس طرح کی اور چیزیں جن کی ضرورت عوام کو ہوتی ہے۔" امام (خلیفہ) کو جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو بطور جاگیر یا بطور ٹھیکہ دے دے، کیونکہ ایسی معدنیات میں عوام کا حق ہے اور جاگیر یا ٹھیکہ پر دے دینے سے ان کا حق ضائع ہوتا ہے۔ خلیفہ کو عوام کا حق باطل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع جلد ۶ صـ ۱۹۴ کتاب الاراضی)

امام (خلیفہ) کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے "معدن ظاہر" کو جن سے عوام کو استغنا نہیں ہو سکتا (ان کو اس کی ضرورت رہتی ہے) جیسے نمک، کحل (سُرمہ) تارکول۔ مٹی کے تیل کا چشمہ اور وہ کنویں جن سے عام لوگ پانی پیتے ہیں۔ وہ کسی کو بطور جاگیر دیدے۔

(درمختار)

اگر وہ کسی کو دے بھی دے گا تو یہ حکم قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ عوام کا حق پھر بھی باقی رہے گا اور جس طرح اس جاگیر دار کو اس معدنی چیز کے لینے کا حق ہوگا عوام کو بھی ہوگا۔

اور معدن ظاہر سے وہ مراد ہے جس کا قدرتی جوہر (جس کی بنا پر اس کو معدن کہا جاتا ہے) اجزاء زمین میں کھلے طور پر ہو۔ (اس کو الگ کرنے میں کوئی خاص ترکیب یا محنت نہ کرنی پڑتی ہو) ما کان جوهرها الذی اودعه الله تعالٰی فی جواهر الارض بارزاً (درمختار کتاب احیاء الموات)

(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے سے جس طرح معدن ظاہر کا ضابطہ معلوم ہُوا دوسرا ضابطہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو "معدن ظاہر" نہ ہو۔ یعنی وہ معدنی جوہر زمین کے اجزاء کے ساتھ اس طرح ملا ہوا ہو کہ اس کو الگ کرنے میں محنت بھی کرنی پڑتی ہو اور مصارف بھی برداشت کرنے پڑتے ہوں جیسے لوہے یا سونے یا چاندی کی کان۔ تو ایسی زمین، جس میں ایسی کان ہو وہ بطور جاگیر کسی کو دی جا سکتی ہے۔

پس ایسی زمین جو کسی کو دے دی گئی اور اس نے اس میں سے معدنی جوہر برآمد کیا

تو کچھ آئمہ مجتہدین تو اس کو تجارتی کاروبار کی حیثیت دیتے ہیں۔ ان حضرات کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی برآمد (پیداوار) پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یعنی چالیسواں حصہ ان کو دینا ہوگا جن کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ اس کو "رکاز" قرار دیتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی (وفی الرکاز الخمس) کے بموجب اس میں خمس یعنی پانچواں حصہ لازم کرتے ہیں یعنی اگر سو من سونا برآمد کیا ہے تو بیس من سونا ادا کرنا ہوگا۔ اور اس کے لیے سال پورا ہونا بھی شرط نہیں ہے، بلکہ جیسے جیسے برآمد ہوتا رہے گا، خمس کا ادا کرنا لازم اور فرض ہوتا رہے گا۔

لیکن موجودہ دور میں یہ بات تعجب انگیز ہوگی کہ مٹی کے تیل یا پٹرول کے چشمے اس طرح عام رہیں جبکہ ان چیزوں نے یہ اہمیت اختیار کرلی ہے کہ دفاع کا مدار ہی ان چیزوں پر ہے، حتیٰ کہ سونے، چاندی، لوہے کی بھی ان کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں ہے تو ایسے ہی مسائل ہیں جن کے احکام وقت اور حالات کے تقاضوں کے بموجب بدلتے رہتے ہیں اور ارشادِ خداوندی وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ (سورۂ نساء، آیت ۸۳) کے بموجب صاحبِ استنباط اور اہلِ علم و نظر اولی الامر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے پھر اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (سورۂ نساء، آیت ۵۸) کے بموجب اولی الامر کی اطاعت اور ان کے وضع کردہ قوانین اور قواعد کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔

پھر چونکہ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ یہاں تک بموجب ارشادِ خداوندی "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۳۸) کوئی معاملہ اور کوئی تجویز، تجویز ہی نہیں ہے جب تک شوریٰ نہ ہو۔

اور امام یعنی خلیفہ پابند ہے کہ شوریٰ کے فیصلے پر عمل کرے یہاں تک کہ اس وقت جبکہ جنگِ اُحد میں کچھ صحابہ سے غلطی ہوگئی تھی اور وہ غلطی ہی شکست کا باعث ہوئی تھی۔ اس وقت بھی صاحبِ شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا:

وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۵۹)

(ان سے (پیش آمدہ) معاملہ میں مشورہ کرو)

یعنی اگرچہ نافذ کرنا خلیفہ کا کام ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر ارشاد ہوا:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ط (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۵۹)

جب تم عزم کر لو (تو شوریٰ پر نہیں بلکہ) خدا پر بھروسہ کرو۔

مگر نفاذ سے پہلے وہ معاملہ قابلِ عمل معاملہ اور وہ فیصلہ، فیصلہ جب ہی قرار دیا جائے گا جب مشورہ ہو چکا ہو، بہرحال شوریٰ کا کام ہوگا کہ وہ حالات اور ضرورتوں کا جائزہ لے اور اسی کے متعلق رائے قائم کرے۔

صاحب بدائع الصنائع موات یعنی افتادہ اور غیر آباد زمینوں کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فالامام یملک اقطاع الموات من مصالح المسلمین لما یرجع ذالک الی عمارۃ البلاد (کتاب الاراضی صـ۱۹۴ ج ۶)

یعنی اصل مقصد مُلک کی تعمیر و ترقی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر امام (خلیفہ) کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ غیر آباد اور دور افتادہ زمینوں کو آبادکاری کے لیے دے دے۔

پس امام (خلیفہ باجلاس شوریٰ) کے لیے یہ تو قطعاً ناجائز رہے گا کہ نمک یا تیل وغیرہ کے چشمے جو مباح الاصل ہیں اور ان سے عوام کی منفعت وابستہ ہے وہ کسی فرد یا افراد کو یا افراد کی جماعت (کمپنی) کو دیدے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کے بھی خلاف ہوگا اور اس نص قرآنی کے بھی خلاف ہوگا جو ہماری بحث کا ماخذ ہے (کی لا یکون دولۃ الآیۃ) البتہ تعمیر و ترقی ملک کے پیش نظر یہ قطعاً جائز ہوگا کہ ان کو بیت المال کی ملک قرار دیا جائے اور حکومت اپنے طور پر ان کا وہ انتظام کرے جو ترقی ملک کے لیے ضروری ہو۔

فان التصرف فیما یتعلق بمصالح المسلمین للامام ککری الانہار و اصلاح قناطرھا (البدائع الصنائع صـ۱۹۴ ج۶)

(۳)

آخر میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے دو واقعے بیان کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جو نہایت دلچسپ، اور سبق آموز بھی ہیں اور موضوعِ بحث کے لیے شمعِ ہدایت بھی۔

(الف) حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ایک بہت بڑا رقبہ جو بہت طویل و عریض تھا، حاصل کر لیا تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو اس کے متعلق تحریر بھی لکھوا دی تھی۔ اس میں وضاحت تھی کہ اس پورے رقبے میں جتنے ٹیلے ہیں جتنی نشیبی زمینیں ہیں اور جتنے معدن وغیرہ ہیں۔ سب ان کو دیدیے گئے۔

جب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ آپ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اتنا طویل و عریض رقبہ حاصل کر لیا اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خصلت مبارکہ یہ تھی کہ وہ سوال رد نہیں فرمایا کرتے تھے، لہٰذا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اتنا بڑا رقبہ آپ کو دے دیا۔ مگر آپ سب کو آباد نہیں کر سکے۔ بہت سا حصّہ خالی پڑا ہوا ہے۔ اب یا تو آپ اس کا ذمّہ لیجیے کہ سب آباد کریں گے ورنہ جس کو آپ آباد نہ کر سکیں اسے واپس کر دیجیے۔ وہ اور لوگوں کو دے دیا جائے گا جو اس کو آباد کریں۔

حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ نے کہا:

"آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو رقبہ عطا فرمایا ہے، قسم بخدا میں اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں کروں گا۔"

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ: "واللہ آپ کو واپس کرنا ہوگا۔"

پس جو حصّہ حضرت بلالؓ آباد نہیں کر سکے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہ حصّہ حکماً واپس لے لیا اور اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

(کتاب الخراج۔ یحییٰ ابن آدم حدیث ۲۹۴ و ابو داؤد شریف، کتاب الامارۃ والفئ والخراج)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے بھی اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ نقل فرمایا ہے، مگر اس اختصار میں یہ تصریح بھی ہے کہ جس حصّہ میں معدن تھے وہ ان سے واپس لے لیا۔

(ب) ھُنَیّ۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں، مگر نہایت ذہین، مستعد، دیانت دار آپ کے معتمد ہیں اور مذہباً عیسائی۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فوج کے گھوڑوں اور اُونٹوں کے لیے جو چراگاہیں محفوظ کر رکھی ہیں، ان میں سے ایک چراگاہ "ربذہ" کے قریب ہے۔ حضرت ھُنَیّ اس کے نگرانِ اعلیٰ ہیں۔ قحط کا زمانہ ہے۔ بارش نہیں ہوئی۔ مویشی کو چارہ نہیں ملتا۔ آس پاس کے مویشی سرکاری چراگاہ میں چلے آتے ہیں۔ ضابطے کے اعتبار سے ان کو پکڑنا چاہیئے۔ مالکوں کو تنبیہہ کرنی چاہیئے، مگر حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ حضرت ھُنَیّ کو ہدایت فرما رہے ہیں:

"اپنے بازو لوگوں سے سمیٹے رکھو (کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو) مظلوم کی بددُعا سے ڈرتے رہو، کیونکہ وہ قبول ہوتی ہے۔"

بقول سعدیؒ

تبرس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درِ حق بہر استقبال مے آید

جن کے پاس اُونٹوں یا بکریوں کے چھوٹے چھوٹے گلے ہیں ان کے جانوروں کو مت روکو، اُن کو آنے دو۔

اور دیکھو۔ ھُنَیّ، عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہما) (جیسے دولتمندوں) کے کسی ایک اُونٹ کو بھی اندر نہ آنے دو، سختی سے روک دو (ان حضرات کے پاس اونٹوں کے علاوہ اور ذرائع بھی ہیں) اگر ان کے اُونٹ مر بھی جائیں تو ان کے باغ ہیں۔ کھیت ہیں (ان سے معاشی ضرورتیں پوری کریں گے) لیکن اگر ان غریب آدمیوں کے مویشی مر جائیں گے تو یہ میرے پاس پکارتے ہوئے آئیں گے۔ یا امیر المومنین، یا امیر المومنین۔ تیرا باپ مرے (لا ابا لک) اے ھُنَیّ، کیا میں ان غریبوں کو چھوڑ سکتا ہوں؟ (مجھے ان کی ضرورتیں پوری کرنی ہوں گی اور نقد رقم خرچ کرنی پڑے گی) اب تم ہی بتاؤ دستا سودا کیا ہے؟) گھاس سستی ہے (جس کو ان کے مویشی چریں گے) یا سونا چاندی۔

اور دیکھو (اس کا ہمیشہ خیال رکھو) یہ زمینیں (جن کو ہم نے بحق حکومت محفوظ کر لیا ہے) انہیں کی زمینیں ہیں۔ (جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ اسلام سے پہلے

حملہ آوروں سے لڑکر اور مقابلہ کر کے انہوں نے اپنی ان زمینوں کو محفوظ رکھا۔ اسلام کا دَور آیا تو اپنی ان زمینوں کی حفاظت کرتے ہُوئے یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے ذہن یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہم نے ان پر ظلم کیا ہے (کہ ان کی زمینیں بحق خلافت ضبط کرلیں اور ان کا "حمیٰ" بنالیا) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ اونٹ نہ ہوتے جن پر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سامان لادا جاتا ہے تو میں کسی ایک کی چپہ بھر زمین بھی ضبط نہ کرتا۔" (بخاری شریف صہ ۴۳)

اسی سلسلہ میں ایک اعرابی حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور بڑے جوش سے تقریر کرنے لگا۔

"یہ آبادیاں اور یہ زمینیں ہماری ہیں۔ زمانۂ اسلام سے پہلے ہم نے جان کی بازی لگاکر اُن کی حفاظت کی۔ پھر ہم اسلام سے مشرف ہوگئے، تب بھی ہم ان کی حفاظت کرتے رہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ (ان کو ضبط کرلیں) اور حمیٰ بنالیں۔"

اعرابی بڑے جوش سے تقریر کر رہا تھا اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ گردن جھکائے ہُوئے تھے۔ سانس پھُول رہا تھا اور اپنی مونچھ مروڑ رہے تھے۔

(یہی عادت تھی کہ پریشانی اور گہرے غور و فکر کے وقت سانس پھُول جاتا تھا اور مونچھ کو امیٹھنے لگتے تھے)

اعرابی نے اپنا اعتراض باربار دُہرایا تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سر اُٹھایا اور فرمایا:

اَلبِلَادُ بِلَادُ اللّٰہِ۔ (وَفِی رِوَایَۃ۔ وَالعِبَادُ عِبَادُ اللّٰہِ وَالمَالُ مَالُ اللّٰہِ) وَنحمی لِنعم مَالَ اللّٰہ یُحمَل عَلَیہَا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ۔ وَاللّٰہ لَولَا مَا اَحمل عَلَیہِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ مَاحمیت مِنَ الاَرضِ شِبراً فِی شِبرٍ۔"

(کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۷۴۰، ۷۴۱ صفحہ ۲۹۹ و ابن سعد بحوالہ فتح الباری صفحہ ۱۳۳، جلد ۶)

مُلک اللہ کا ہے۔ انسان اللہ کے ہیں۔ مال اللہ کا ہے۔ یہ اُونٹ اللہ

کے ہیں (جن کے لیے یہ چراگاہ بنائی گئی ہے) وہ مال جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ہے جو ان پر لادا جاتا ہے۔ اگر یہ مال نہ ہوتا اور اس کو لادنے کے لیے اونٹوں کی ضرورت نہ ہوتی تو خدا کی قسم میں کسی کی ایک مربع بالشت زمین بھی ضبط نہ کرتا۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۹۹)

وہاں سب کچھ اللہ کے لیے تھا۔ یہاں سب کچھ پیٹ کے لیے ہے (معاذاللہ)

دوسرا فرق یہ ہے کہ دورِ حاضر میں تیل اور پٹرول وغیرہ نے وہ اہمیت حاصل کرلی جو اس زمانہ میں اونٹ، گھوڑے اور گھاس کو تھی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اس وقت زمینوں کو بیت المال کے تصرف میں لے کر "حمیٰ" بنایا گیا۔ اب کانوں اور چشموں اور دیگر جنگی ضرورتوں کی چیزوں کو بیت المال کے تصرف میں لیا جاسکتا ہے اور قومی ملک بنایا جاسکتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۱۰) فَے

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، مفتوحہ علاقے کی اراضی کو "فَے" کہا جاتا ہے۔ اگر ان اراضی کو اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا جائے اور منافع کے متعلق کوئی معاہدہ ہوجائے تو اس آمدنی (خراج) کو بھی فَے کہا جاتا ہے۔

(کتاب الاموال لابی عبید ص ۱۶)

"اَمّا الفئُ فھو الخراج عِندنا خراج الارض" الامام ابویوسف
(کتاب الخراج ص ۲۳)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے دَورِ مسعود میں یہ بھی کیا کہ خُمس کا حصّہ مستثنیٰ کرکے باقی حصّوں کی اراضی مجاہدین پر تقسیم کردی اور ایسا بھی ہُوا کہ کوئی دستہ کسی مہم پر بھیجا گیا۔ اس کے لیے کسی مخصوص حصّہ کا وعدہ فرمالیا گیا کہ کامیابی کے بعد وہ حصّہ اس دستہ کے مجاہدین کو "بطورِ انعام" دیا جائے گا۔ اس کو "نفل" کہا جاتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عراق فتح ہُوا۔ فتح عراق کے سلسلے میں "معرکہ قادسیہ" بہت سخت اور فیصلہ کُن تھا۔ مفتوحہ علاقوں کے متعلق جو دستور اب تک رہا تھا، اس کی بنا پر جنگِ قادسیہ کی کامیابی کے بعد ایک رائے یہ تھی کہ مفتوحہ علاقہ

مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے، لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے ملک کی تعمیری دفاعی خصوصاً عوام کی معاشی ضرورتوں کا سوال تھا کہ اگر مفتوحہ علاقہ مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے تو جاگیردار تو بہت سے ہو جائیں گے، جن کی جائدادیں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد میں تقسیم ہوتی رہیں گی، مگر ان کے علاوہ دوسرے لوگ خصوصاً بعد کی نسلیں (آخر الناس) "ببان" (خالی) رہ جائیں گی (لَیْسَ مَعَھُم شَی) لہٰذا آپ کی رائے یہ ہوئی کہ تقسیم کے بجائے ان اراضی کو "خزانہ" بنا دیا جائے۔ جس کو سب تقسیم کرتے رہیں گے۔

"اترکہا خزانۃ لھُم یقتسمُونہا" (بخاری شریف ص۶۰۸ باب غزوۂ خیبر وکتاب الاموال لابی عبید ص۵۶ فقرہ ۱۴۳ وکتاب الخراج لابی یوسف ص۲۴)

مشترک خزانہ کی وضاحت آپ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

"لئن بقیت لاَدعنّ ارامل اھل العراق لا یفتقرون الیٰ امیرٍ بعدی۔" (کتاب الخراج لابی یوسفؒ ص۳۷)

ترجمہ: اہلِ عراق کی بیوہ عورتوں کے نصیب سے اگر میں زندہ رہا تو انہیں ایسا کردوں گا کہ میرے بعد کسی اور امیر کے (فرمان یا پروانہ) کی ان کو ضرورت نہ رہے گی۔

صحابہ کرام کے خیالات مختلف تھے۔ کچھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مخالف تھے، کچھ موافق۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کا عام اجتماع کیا۔ اس اجتماع میں ہر ایک نے آزادی سے اپنی رائے ظاہر کی۔ آخر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے سورۂ حشر کی وہ آیتیں پیش کیں جن میں مختلف طبقات (مہاجرین اور انصار) اور اُن کی آئندہ نسلوں اور ان کے علاوہ تمام ضرورت مند مسلمانوں کا ذکر ہے جو اب موجود ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں اور تقسیم کر دینے کے حکم کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے "لایکونَ دُولَۃً" وہ دولت مندوں کے قبضہ کی چیز بن کر نہ رہ جائے۔

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے آپ نے یہ تجویز پیش فرمائی:

"قد رایت ان احبس الارض بعلوجہا واضع علیھم فیھا الخراج وفی رقابھم الجزیۃ یؤدونہا۔" (کتاب الخراج ص۲۵)

ترجمہ: میری رائے ہے کہ زمین کو کاشت کاروں کے پاس رہنے دو ان زمینوں کا خراج مقرر کر دیا جائے اور کاشت کاروں پر جزیہ لگا دیا جائے۔"

اس کانفرنس اور بحث مباحثہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

" فاجمع علی ترکہ وجمع خراجہ "۔ (کتاب الخراج لابی یوسف ص۲۵)

یہی طے ہو گیا کہ زمینیں کاشت کاروں کے پاس چھوڑ دی جائیں اور اُن سے خراج وصول کیا جاتا رہے۔

لطیفہ: ممکن ہے آجکل کی سرکاری زبان میں کہہ دیا جائے کہ کاشت کاروں کو "بھومی دھر" بنا دیا گیا (واللہ اعلم بالصواب)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دورِ مسعود میں (۷ھ) خیبر فتح ہُوا تو وہاں کے اصل باشندوں (یہود) سے طے کر لیا گیا کہ فی الحال وہ اپنی زمینوں اور باغات پر قابض رہیں گے اور پیداوار کا نصف حصّہ ادا کرتے رہیں گے۔ اس آمدنی میں ان چودہ سو مجاہدین کے حصّے مقرر کر دیے گئے جو اس غزوہ میں شریک تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حصّہ مِلا تھا، اس میں سے آپ نے ہر ایک زوجہ محترمہ کا حصّہ مقرر فرما دیا تھا۔ شرائط معاہدہ کے پیشِ نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان یہود کو خیبر سے تیماء اور اریحا منتقل کر دیا اور خیبر خالی کرا لیا تو اب آمدنی کے بجائے خیبر کی زمینیں اور باغات اِن مجاہدین یا ان کے وارثوں کو دے دی گئیں اور ازواجِ مطہرات کو اختیار دے دیا کہ:

"ان یقطع لھُنّ من الماء والارض او یمضی لھُنّ"۔

(بخاری شریف ص۳۱۳۔ کتاب الخراج لابی یوسف ص۸۹)

وہ چاہیں تو ان کے حصّہ کے بموجب زمین اور پانی (یا کنواں یا چشمہ) دے دیں یا جس طرح جَو اور کھجور کی شکل میں ان کو نفقہ اب تک مِل رہا ہے اسی طرح پیش کیا جاتا رہے۔

مختصر یہ کہ خیبر کی زمینیں کاشت کاروں سے لے کر مجاہدین کو دے دی گئیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی (یعنی ان اراضی کو بیت المال

کے تصرّف میں نہیں دیا) کیونکہ خلیفہ کو یہ حق نہیں ہے کہ جو بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت کے ساتھ ثابت ہوچکی ہے اس میں کوئی ترمیم کرے، لہٰذا جو تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی تھی اس کو باقی رکھا، البتہ جنگِ قادسیہ کا ایک معاملہ خاص طور پر مستحق توجہ ہے۔ اس سے توسیع بیت المال کا مفہوم بھی واضح ہوجائے گا۔

بجیلہ، یمن کا مشہور طاقتور قبیلہ تھا۔ حضرت جریر بن عبداللہ اس کے شیخ اور رئیس تھے۔ معرکۂ قادسیہ کی تیاری ہورہی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"آپ اس معرکہ میں شرکت کریں آپ کو عراق کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی دے دیا جائے گا۔" (یحییٰ بن آدم ص۴۵)

حضرت جریر رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ کو لے کر عراق پہنچے، جہاد میں شرکت کی۔ اہلِ قبیلہ نے اس کثرت سے جہاد میں شرکت کی کہ پوری فوج میں مجاہدین کی جو تعداد تھی اس میں ۲۵ فی صد (ایک چوتھائی) اس قبیلہ کے مجاہدین تھے۔ دشمن پر ان کا دباؤ بھی اتنا سخت تھا کہ دشمن نے اپنے اٹھارہ ہاتھیوں میں سے سولہ ان کے مقابلہ میں جھونک دیے اور صرف دو ہاتھی باقی فوج کے مقابلہ میں تھے۔ یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ "باس الناس ھاھنا بجیلہ" (ابو یوسف ص۳۱)

ترجمہ: اس میدان میں بجیلہ ہی نے دھاک جمائی ہے (اور پالہ جیتا ہے)

اللہ تعالیٰ نے اس معرکہ میں کامیابی عطا فرمائی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حسبِ وعدہ مفتوحہ علاقہ کا ایک چوتھائی اس قبیلہ کے مجاہدین کو تقسیم کردیا۔ تین سال تک یہ علاقہ ان کے پاس رہا یہ اس کی آمدنی وصول کرتے رہے "فاکلوہ ثلاث سنین" (ابو یوسف ص۳۲)

مگر تین سال بعد (بروایت یحییٰ بن آدم دو یا تین سال بعد۔ بظاہر اراضی عراق کے متعلق مذکورہ بالا پالیسی طے ہونے کے بعد جدید بندوبست کے وقت ایسا ہوا کہ) حضرت جریر رضی اللہ عنہ کسی کام سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"یا جریر انی قاسم مسئول۔ لولا ذالك لسلمت لکم ماقسمت لکم ولکن اری ان یرد علی المسلمین" (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۳۲)
ومعناہ عند یحیٰی ابن آدم ص ۴۵)

ترجمہ: جریر! میرا کام تقسیم کرنا ہے۔ میں جوابدہ ہوں۔ اگر جوابدہی کی ذمہ داری نہ ہوتی تو جو حصہ میں تمہیں دے چکا تھا وہ تمہارے ہی سپرد رکھتا لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کو واپس کر دیا جائے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ایک طے شدہ پالیسی کی بنا پر تھی۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس سے کب گریز کر سکتے تھے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اس علاقہ کو واپس کر دیا۔

فاجاز عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بثمانین دیناراً (ابویوسف ص ۳۲
یحیٰی بن آدم ص ۴۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بطور جائزہ (انعام پیشکش) اسی دینار عطا فرمائے۔

ظاہر ہے عراق کا یہ چوتھائی علاقہ کاشت کاروں کو نہیں دیا گیا۔ یہ بیت المال کا قرار دیا گیا۔ اسی بنا پر بیت المال سے اسی دینار دیئے گئے۔ اس تغیر اور تصرف کے بعد اس کی پوری آمدنی بیت المال کی رہی جو بیت المال کے مصارف میں صرف ہوتی رہی۔

یہ توسیع بیت المال کی ایک شکل ہے۔ مجلس شوریٰ مصالح امت کے پیش نظر اس پر بھی غور کر سکتی ہے۔ (کتاب الخراج لامام ابی یوسف ص ۶۸ ص ۶۹)

لیکن فقہا کی واضح تصریح یہ بھی ہے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم کی کوئی ملک ادا قیمت کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔

لیس للامام ان یخرج شیئاً من ید احدٍ الا بحق ثابت معروف

(کتاب الخراج لابی یوسفؒ ص۶۵ والتفصیل فی ردالمحتار فی باب العشر والخراج والجزیہ ص۲۵۳ تا ص۲۵۵ ج۳)

البتہ قبیلہ بجلیہ کی طرح کوئی جماعت بطیب خاطر بیت المال کو ہبہ کر دے یا بیت المال کے عطیہ کو واپس کر دے تو یقیناً عنداللہ وعندالناس مستحق شکریہ ہوگی اور طیب خاطر کے لیے خلیفہ وقت کچھ عطا کرے تو سنت فاروقی اس کی بھی اجازت دیتی ہے (واللہ اعلم بالصواب)

(۱۱) اجرت املاک (کراء الارض)

ملک کی تعمیر و ترقی اور دفاعی لحاظ سے ملک کا استحکام حکومت کا مسلّمہ فریضہ اور ایک بنیادی مقصد ہے۔ ضرورت اور حالات کے مطابق اس کی صورتیں طے کی جائیں گی اور ان پر عمل کیا جائے گا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ افتادہ یا لاوارث زمینوں کو کو کارآمد بنایا جائے اور اس طرح بیت المال کے محاصل میں اضافہ کیا جائے۔ یہ زمینیں بیت المال کی ملکیت ہوتی ہیں۔ اصطلاحاً ان کو "ارض الحوز" یا "ارض المملکت" کہا جاتا ہے۔ یہ زمینیں عشری یا خراجی نہیں ہوتیں۔ بیت المال ان کو فروخت بھی کر سکتا ہے ان میں کرایہ کے لیے مکان بھی بنوا سکتا ہے اور ان کو کاشت کے لیے اجرت یعنی کرایہ پر بھی دے سکتا ہے کہ کاشت کار مقررہ اجرت (کرایہ) ادا کرتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ کاشت کاروں پر جبر و قہر قطعاً نہ ہو، اس سلسلہ میں جاگیر دارانہ نظام کی صورت بھی بن سکتی ہے۔ مثلاً کاشت کاروں کی زندگی کسی رقبہ زمین کے ساتھ اس طرح جوڑ دی جائے کہ وہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ اور پیداوار ہو یا نہ ہو، ان کو مقررہ کرایہ لامحالہ ادا کرنا ہوگا۔ شریعت نے اس کو جائز قرار نہیں دیا بلکہ اس کو حرام کہا ہے اور اس کی سخت ممانعت کی ہے۔

واجارہ علی السکنٰی فی بلدۃ متعینہ یُعَمِّرُ دارہ و یزرع الاراضی حرام (درمختار)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (درمختار، ردالمحتار ج۳، باب العشر والخراج والجزیۃ)

ضرب یا قرض

(۱)

ضرائب جبکہ صرف نظریات پیش کیے جا رہے ہیں تو مصارف حکومت کے جملہ مدّات کا بیان کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ یہ مختصر بات کافی ہے کہ دورِ حاضر میں سائنسی ترقیات اور دفاعی ضرورتوں کو خرچ کا سب سے زیادہ وسیع، ضروری اور اہم مد قرار دیا جاتا ہے، لیکن اسلام کی نظر میں روحانی اور مادی تربیت، حکومت کا سب سے اہم فرض اور بنیادی مقصد ہے۔ دفاعی ضرورتیں اضافی اور عارضی ہیں اور "تربیت" اصلی اور حقیقی ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: "الخلق عیال اللہ" (حدیث شریف)

"ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔"

اور قرآنِ حکیم کا اعلان ہے کہ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا"

ترجمہ: زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں ہے جس کی روزی کا انتظام اللہ کرتا ہو۔

(سورہ ہود ۱۱، آیت ۶)

اور لطف یہ ہے کہ دستورِ اساسی یعنی (قرآنِ حکیم) میں دستور عطا فرمانے والے کا نام لیا گیا تو اس کا سب سے پہلا وصف وہی بیان کیا گیا جس کا تقاضا ہمہ گیر تربیت اور عمومی پرورش ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

یہ دستورِ اساسی کا سب سے پہلا فقرہ ہے جس کو ھُدیٰ اور بُشریٰ بنا کر نازل کیا گیا۔

(۲)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعدد ارشادات ان صفحات میں گزر چکے ہیں

جن کا حاصل یہ ہے کہ جو صوبہ فتح کر کے اسلامی نظامِ حکومت میں داخل کیا گیا اس میں
میں جو مالی نظام قائم کیا گیا اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ بیوہ عورتیں جو گھروں میں پڑی
ہیں وہ چرواہے جو کسی دامنِ کوہ میں یا کسی دریا کے کھادر میں اپنے گلّے چرا رہے ہیں ان
کے وظیفے گھر بیٹھے ان کے پاس پہنچ جایا کریں۔ نہ کسی کو سفر کی زحمت اٹھانی پڑے نہ
آفتاب کی تیز کرنوں سے چہرہ تپانا پڑے۔
(کتاب الخراج للامام ابو یوسف ص۳۶ وص۴۶)

(۳)

جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی اور اخلاقی تربیت یعنی تعلیم بھی اتنی ہی ضروری
ہے۔ رب العالمین کا عطا فرمودہ دستورِ اساسی اس کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتا ہے۔ اس
سلسلہ میں کچھ اشارات "قانون یا تعلیم و تربیت اور تقسیم فرائض" کے باب میں گزر بھی چکے ہیں۔
ان ہمہ گیر فرائض کو سامنے رکھ کر آمدنی کا موازنہ کیا جائے گا۔ اگر آمدنی ناکافی ہے
تو اس کو پورا کرنے کے لیے آجکل کی اصطلاح میں خسارہ کو ختم کرنے کے لیے اصحاب
استطاعت سے مزید مطالبات کیے جائیں گے۔ ان مطالبات کو ضرائب کا عنوان دیا گیا ہے۔

(۴)

ضرائب کا عنوان، [illegible] ں کے قوانین کے لحاظ سے موزوں ہو سکتا ہے، مگر
ایثار و اخلاص کی جو روح قرآنِ حکیم پیدا کرتا ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ عنوان غیر موزوں
ہی نہیں ہے، بلکہ توہین آمیز بھی ہے۔ ضرب کے معنی مقرر کرنا اور ضریبہ (جس کی جمع ضرائب)
ہے ٹیکس کو کہا جاتا ہے، جو کسی پر مقرر کر دیا جائے اس لفظ کے ایک رخ سے جبر و قہر
اور دوسرے رخ سے خود غرضی، تنگ دلی، ذخیرہ اندوزی اور حرص و طمع کی بو آتی ہے۔
گویا خلقِ خدا بھوک اور فاقہ سے تباہ حال ہے۔ ان کی زندگی برباد اور ان کی اولاد کا
مستقبل تباہ ہو رہا ہے۔ سرحدوں پہ دشمن منڈلا رہا ہے، مگر اصحابِ دولت کا دل
نہیں پسیجتا۔ ان کے سینوں میں گوشت کے لوتھڑوں کی بجائے پتھر بھر دیے گئے ہیں لہٰذا
ملک کے اربابِ حل و عقد مجبور ہوتے ہیں کہ ان پتھروں میں جونک لگائیں اور ایسا قانون

بنائیں کہ سنگ دل سرمایہ داروں کی تجوریوں سے کچھ برآمد کیا جا سکے۔ قرآنِ حکیم اس کو فساد فی الارض قرار دیتا ہے (مطالعہ فرمائیے سورۂ قصص ۲۸ آیت ۷۷، اعراف ۷ آیت ۸۵، ۸۶۔ سورہ ہود ۱۱ آیت ۸۳ و ۸۴ وغیر ذالک من الآیات)

جب آمدنی کے معینہ مدّات ناکافی ہوں تو بلا شبہ آمدنی بڑھانے کی ضرورت ہوگی اور کچھ ہنگامی محاصل جن کو آج کل اصطلاح میں "ایمرجنسی ٹیکس" کہا جا سکتا ہے۔ اغنیاء اور اہلِ ثروت پر عائد کیے جائیں، ان کو ضرائب کہا جاتا ہے۔ مالکی مسلک کے مشہور فقیہہ اور محدّث علّامہ ابن حزم نے اس کے دلائل پیش کیے ہیں (ملاحظہ ہو اسلام کا اقتصادی نظام از مجاہد ملّت ؒ صـ۱۲۲، صـ۳۴۷، صـ۳۵۴)

مگر قرآنِ حکیم نے ضربیہ (ٹیکس) نہیں بلکہ قرض کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اور قرض بھی کسی اَور کے لیے نہیں، اللہ کے لیے۔ اس لطیف اور وجد آفرین اصطلاح کی تفصیل پہلے گزُر چکی ہے۔ کچھ اشارے یہاں بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) ابھی دعوتِ اسلام کا آغاز ہُوا تھا کہ سورۂ مزمل ۷۳ کی آخری آیت کے چند الفاظ میں پورا پروگرام پیش کر دیا گیا۔

"نماز کی پابندی رکھو۔ زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اخلاص سے قرض دو۔"

(۲) سورہ بقرہ ۲ کی آیت ۲۴۳ میں فرمایا گیا:

"اللہ کے راستہ میں جہاد کرو" (اور یقین رکھو کہ اللہ سب سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے)

توساتھ ساتھ قرض کی ترغیب بھی فرمائی: کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو خوش دِلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کا قرض دوگنا چوگنا زیادہ کر کے ادا کرے۔

(سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۴۵)

(۳) سورۂ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ۴۷ کی آخری آیتیں بار بار گذر چکی ہیں جن میں

ترغیب کے علاوہ تفہیم بھی ہے کہ قوم اور آپ دو دو جُدا جُدا چیزیں نہیں ہیں کہ ان کی ضرورتیں الگ الگ ہوں جن کو قومی ضرورت کہا جاتا ہے وہ خود آپ کی اپنی ضرورتیں ہیں۔ اگر بخل کرتے ہو تو خود اپنے آپ سے بخل کرتے ہو۔

سورہ بقرہ ۲ میں ارشاد ہوا:

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور ایسا نہ کرو کہ (قومی ضرورتوں سے غافل ہوکر اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو" (آیت ۱۹۴)

بایں ہمہ نوعِ انسان اور خلقِ خدا کے عمومی مفاد کو سامنے رکھ کر یہ قرض دیا جارہا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کو اپنی مدد قرار دیتا ہے اور پختہ وعدہ کرتا ہے کہ:

"جو خدا کی مدد کرے گا یقیناً اللہ بھی اس کی مدد فرمائے گا"

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (سورہ حج ۲۲ آیت ۴۰)

یہ ہے اسلامی تعلیمات کے پیشِ نظر اقتصادیات کا ایک مختصر خاکہ۔ حضرات اہلِ علم غور فرمائیں تو قرآن حکیم کے دریاء ناپیدا کنار سے بے شمار درہائے شاہوار حاصل کر سکتے ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ط وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ٥

نیازمند

محتاجِ دعا

محمد میاں

رجب ۱۳۹۰ھ

ستمبر ۱۹۷۰ء

جمہوریت اپنے آئینہ میں اور اسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ

جنابِ محترم اختر عالم صاحب زبیری نے روزنامہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر صاحب کو تحریر فرمایا تھا: "میں نے الجمعیۃ میں اسلام اور سوشلزم کے بارے میں جناب مولانا محمد میاں صاحب کا فتویٰ پڑھا ہے جو بہت جامع ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سے گذارش ہے کہ آپ اسلامی ملک میں ڈیموکریسی پر روشنی ڈالیں۔ میرا خیال ہے کہ جہاں اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے وہاں جملہ اختیارات صدر کو حاصل رہنے چاہئیں نہ کہ وزیرِ اعظم کو، کیونکہ اسلامی ملک کا سربراہ امام ہوتا ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو کسی بھی اسلامی ملک میں موجودہ طرز کی جمہوری حکومت غیر اسلامی ہے۔ پھر بھی علّامہ مودودی پاکستان کی ڈیموکریسی پر خاموش ہیں۔ امید ہے میرے اس استفسار کا جواب بھی شریعتِ اسلامی کی روشنی میں دیا جائے گا۔"

الجواب

جناب کا خیال صحیح ہے، اسلامی مملکت میں جملہ اختیارات ایک ہی کو دیئے جاتے ہیں۔ اس کو امام کہا جاتا ہے جو پوری مملکت کا واحد سربراہ ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک کی تعلیم یہ ہے کہ وہ سربراہ اقتدار میں سب سے اعلیٰ ہو، تو تقویٰ، پرہیزگاری اور خدا ترسی میں

بھی اس کو سب سے بلند ہونا چاہیئے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ

علماء نے امام کے لیے چند شرطیں اسی لیے قرار دی ہیں کہ حتی الامکان قرآن پاک کی تعلیم کو جامۂ عمل پہنایا جا سکے۔ مثلاً عاقل، بالغ، تندرست، صحیح الحواس، صاحبِ ہمت، صاحبِ حوصلہ، صائب الرائے سیاسی امور کا واقف و ماہر، جنگ و صلح کے نشیب و فراز سے باخبر، خلقِ خدا کا ہمدرد، عوام کا خیرخواہ، مختلف طبقات کے مزاجوں سے واقف ہونے کے علاوہ اہم شرط یہ ہے کہ اس میں عدل ہو، یعنی پابندِ شرع ہو۔ اسلامی اخلاق کا حامل ہو، کبائر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ بتقاضائے بشریت گناہ ہو جائیں تو فوراً توبہ کرلے، کسی گناہ صغیرہ کا بھی عادی نہ ہو۔ عالم ہو اور اسلامی علوم میں بصیرت رکھتا ہو۔ (ازالۃ الخفاء، حجۃ اللہ البالغہ و شرح عقائد نسفی وغیرہ)

وزیرِ اعظم کی جو حیثیت آج کے جمہوری ممالک میں ہے کہ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جس سیاسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو اس کا لیڈر وزیرِ اعظم یا چیف منسٹر ہو، اسلامی تعلیمات میں اس طرز کی اگر ممانعت نہیں کی گئی تو اس کی ہدایت بھی نہیں کی گئی۔

جمہوریت پر ایک نظر

کوئی بھی موسم ہو اس میں اس موسم کے خاص پھل کی بہار ہوتی ہے۔ زبانوں پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے، دلوں میں اس کی رغبت اور خواہش، بازار اور منڈیوں میں اس کی کثرت ہوتی ہے۔ تجربہ نے چہرۂ جمہوریت کے خوشنما اور دل کش غازہ کو بڑی حد تک کھرچ دیا ہے، مگر تقریباً چالیس سال پہلے کا دَور وہ تھا جس میں یورپ کی استعمار پسند حکومتیں دُنیا پر چھائی ہُوئی تھیں۔ وہ دور تصورِ جمہوریت کا موسم بہار تھا۔ شکنجۂ استعمار میں کسی ہُوئی قوموں کے مضطرب جذباتِ تصورِ جمہوریت کا استقبال کر رہے تھے، اور یہ تصور اہلِ دانش، اہلِ نظر اور اصحابِ فکر کی عقل و دانش پر یہاں

تک چھپایا ہوا تھا کہ وہ کھینچ تان کر اسلام کو بھی اپنی ہی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے کہ جمہوریت کے جس تخیّل کو وہ متاعِ بے بہا سمجھ رہے ہیں اسلام بھی اس کی تعلیم دیتا ہے اور بازارِ سیاست میں اس کا خریدار ہے۔

لیکن اگر ہم جذبات سے بالا ہو کر حقیقت کو سامنے رکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب جمہوریت کی موافقت نہیں کر سکتا۔ جس طرح جمہوریت۔ اگر صحیح معنی میں جمہوریت ہے تو وہ مذہب کے تابع نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہم جمہوریّت کے ثنا خواں و مدّاح اس لیے ہوتے ہیں کہ اس میں عوام کو آزادی میسر آتی ہے۔ رائے کی آزادی، فکر کی آزادی، تحریر کی آزادی، تقریر کی آزادی، مطلق العنان حریت یعنی بے لگام آزادی، حالانکہ کوئی بھی مذہب اس مطلق العنان حریت یعنی بے لگام آزادی، حالانکہ کوئی بھی مذہب اس مطلق العنان، بے لگام اور مُنہ چھُوٹ آزادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہر ایک مذہب اخلاق کا طوقِ زرّیں انسان کے گلے میں ڈالتا ہے۔ اس کا اصل اصول ہوتا ہے۔ پابندی، فرمانبرداری، ضبط و کنٹرول، ایثار اور قربانی۔ اس کے برعکس مطلق العنان آزادی جو جمہوریت کا طرۂ امتیاز مانی جاتی ہے، رفتہ رفتہ آوارگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

آپ تحقیق فرمائیں تو مہذّب ترین جمہُوری ممالک کاروباری ضابطوں اور قاعدوں میں وہ خواہ کتنے ہی با اصول ہوں مگر اخلاق، کردار، روحانیت، خوفِ خدا اور خدا پرستی کے لحاظ سے وہ آوارہ اور شورہ پشت ہیں۔

بے شک جمہوریت کا یہ رُخ قابلِ قدر ہے کہ اصولاً ایک فرقہ کو دوسرے پر مسلّط نہیں کرتی اگرچہ عملاً اس سے نجات بھی نہیں مِل سکتی کیونکہ اکثریت اگر کسی ایک فرقہ سے تعلّق رکھتی ہے تو وہ لامحالہ اپنی چھاپ جمہُوریت پر ڈال دیتی ہے یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کے ہم رنگ ہونا۔

فریبِ نظر اور طلسم

جمہُوریت اور ڈیموکریسی کے ثنا۔خواں جمہُوریت کی یہ خُوبی بیان کرتے ہیں کہ جمہوریت

یں اقتدارِ اعلیٰ جمہور کو حاصل ہوتا ہے۔ حکومت جمہور کی ہوتی ہے اصل اختیارات جمہور کو حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لیے اپنی مرضی کے مطابق دستورِ اساسی (CANSTITUTON) اور قانون تجویز کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت پسندانہ نظر ڈالی جائے تو یہ تمام الفاظ طلسم اور جادو کے منتر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، جو دماغوں کو مسحور ضرور کر لیتے ہیں، مگر حقیقت اور واقعیت سے آشنا نہیں ہوتے۔

جمہور کے پاس ووٹ کی طاقت ضرور ہوتی ہے، مگر کیا اس حقیقت سے انکار ہو سکتا ہے کہ جس طرح گری نکال دینے کے بعد بادام کا چھلکا کوڑا کرکٹ یا ایندھن بن جاتا ہے، ووٹ دینے والے بھی ووٹ دینے کے بعد بے مغز پوست بلکہ گرد پا بن جاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ مغز ہی اصل ہے، بادام کی گری ہی بادام کا حاصل ہے۔ اگر گری کام آرہی ہے تو بادام بے کار نہیں گیا۔ اور ضائع نہیں ہوا۔ عوام کے نمائندے قانون بنا رہے ہیں تو وہ قانون عوام ہی کا بنا ہوا قانون ہے۔ اگر وہ نمائندے حکومت کر رہے ہیں تو وہ عوام ہی کی حکومت ہے۔

مگر کیا واقعی یہی ہوتا ہے کہ قانون عوام کے نمائندے بناتے ہیں اور عوام کے نمائندے ہی حکومت کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ اسّی فیصد نمائندے وہ ہوتے ہیں جو قانون بنانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ سینکڑوں ممبروں کے ایوان میں چند افراد کی کمیٹی بنا دی جاتی ہے جو قانون کا مسوّدہ تیار کرتی ہے۔ اصل واضع قانون یہ کمیٹی ہوتی ہے۔ دس پندرہ فیصد وہ ہوتے ہیں جو قانون کو سمجھتے ہیں باقی تعداد جو سینکڑوں کی ہیبت انگیز اور مرعوب کُن تعداد ہوتی ہے۔ اس دس فیصد کی تقلید کرنے والی ہوتی ہے۔

جمہوریہ ہند کا دستورِ اساسی جن پر مفکرینِ ہند کو ناز ہے اور جس کا وہ ساری دُنیا میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، بے شک وہ مجلسِ دستور ساز کا منظور کردہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تقریباً پانچسو تھی جس میں اقلیتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا

مسودہ ایک کمیٹی نے تیار کیا اور کمیٹی کے ارکان نے بھی سہولتِ کار کے لیے تدوین اور ترتیب کا کام ایک قابل شخص (ڈاکٹر امبیدکر) کے سپرد کر دیا تھا۔ مسودہ تیار کرنے میں کمیٹی کے ارکان بھی وقتاً فوقتاً ان کی مدد کر دیتے تھے۔ بلیشک وہ مسودہ ارکان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسمبلی کے اجلاس میں اس کی ایک ایک دفعہ پڑھی گئی۔ اس میں ترمیمات بھی ہوئیں، لیکن یہ سب نقش و نگار کی تبدیلیاں تھیں۔ بنیادی ستون وہی رہے جن کی بنیاد ڈاکٹر امبیدکر نے ڈالی تھی۔

اور اگر ہم اس نمائش ہی کو حقیقت گردان لیں اور تسلیم کر لیں کہ دستورِ اساسی دستور ساز اسمبلی ہی کے ارکان نے مرتب کیا تھا اور ہر ایک رکن وضع قانون اور ترتیب دستور اساسی کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اس نے تدوین و ترتیب میں پوری توجہ اور دماغ سوزی سے کام لیا تب بھی ظاہر ہے کہ اس دستورِ اساسی اور اس کی دفعات کی منظوری اکثریت کی رائے پر موقوف تھی اور ایوان میں اگر ایک پارٹی مثلاً کانگریس کی اکثریت تھی تو یہ دستورِ اساسی ایک پارٹی کا دستور ہوا اور جمہوریت کا مصداق صرف یہی اکثریت ہوئی۔

پھر یہ ہو سکتا ہے کہ اس پارٹی کے ووٹوں کی مجموعی تعداد مخالفین کی تعداد سے کم ہو، مثلاً جمہور کے تیس فیصد ووٹ کانگریس کو ملے اور ستر فیصد ووٹ دوسری پانچ چھ پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تو بلیشک ایوان میں اکثریت کانگریس کو حاصل ہو گئی، مگر ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی اکثریت تیس فیصد کی نمائندگی کرتی ہے اور اب جمہور کا اطلاق صرف تیس فی صد پر ہو رہا ہے۔

یہ دستورِ اساسی کے وضع و ترتیب کی صورت تھی جس کو تمام قوانین میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ جملہ قوانین اس ڈھانچہ کا گوشت پوست ہوتے ہیں جو دستور ساز اسمبلی دستورِ اساسی کی صورت میں تیار کرتی ہے۔

دستورِ اساسی کے علاوہ عام قانون جو اجلاسوں میں پیش ہو کر منظور ہوتے رہتے

ہیں۔ اور جمہوریت کے نام پر انہیں جمہور کے سر تھوپا جاتا ہے۔ ان کے واضعین درحقیقت وہ چند افراد ہوتے ہیں جو کابینہ (CABENET) کے رُکن ہوتے ہیں۔ کیبنٹ کا پیش کردہ مسوّدۂ قانون پارٹی کو لامحالہ منظور کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کو مسترد کرنے کے معنی ہوتے ہیں گورنمنٹ پر بے اعتمادی ظاہر کرنا۔ مختصر یہ کہ عوامی حکومت اور جمہور کے اقتدارِ اعلیٰ کے نعرے صرف نمائشی ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ اقتدارِ اعلیٰ چند افراد کے چھوٹے سے حلقے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

بے شک اسلام جمہوریت کا حامی ہے بلکہ بانی ہے، مگر اس کے معنی یہ ہیں:

(۱) تمام انسان درجۂ انسانیت میں مساوی ہیں۔ وہ کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، مشرقی ہوں یا مغربی سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

(۲) ایک انسان کا درجہ دوسرے انسان سے اگر بلند رہے تو وہ رنگ، نسل، دولت، ثروت یا کسی جغرافیائی بنیاد پر نہیں، بلکہ درجہ اگر بلند ہو سکتا ہے تو صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر اور اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ کی بلندی تقویٰ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

(۳) بادشاہت، اقتدارِ اعلیٰ کو نسل اور خاندان کے تابع کرتی ہے کہ باپ بادشاہ تھا تو بیٹا بھی بادشاہ ہوگا۔ اسلام اس سے نفرت کرتا ہے۔ ملک الاملاک اور شاہنشاہ جو دُنیا میں سب سے زیادہ باعظمت لفظ ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔ (بخاری شریف ۹۱۶)

وہ اقتدارِ اعلیٰ کو صلاحیت اور قابلیت کے تابع کرتا ہے۔ سورہ ۲ (البقرہ آیت ۲۴۷)

(۴) ہر شخص ذمہ دار ہے وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں جوابدہ ہے۔ غریب ہو یا امیر۔ حاکم ہو یا محکوم۔

(۵) امام (سربراہ مملکت) مملکت کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے، مگر وہ مشورہ کا پابند ہے اور مسلمانوں کے تمام معاملات مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

وضع قانون | اگر کسی ایک شخص کو یہ حیثیت نہیں دی جاسکتی کہ وہ خلقِ خدا کا

مالک ہو اور جو کچھ وہ کہدے قانون بن جائے اگر اس کو استبداد اور جبر و قہر کہا جاتا ہے تو چند افراد کو بھی یہ حیثیت نہ ملنی چاہیئے کہ وہ قانون ساز بن کر خلق خدا کی جانوں اور ان کی ملکیتوں میں تصرّف کریں۔ واضع قانون خود تصرّف نہیں کرتا، کسی کو پھانسی، کسی کی جاں بخشی، کسی کے قید و بند، کسی کے مال ضبط کر لینے اور کسی پر جرمانہ کر دینے کا عمل وہ خود نہیں کرتا۔ مگر جب ان امور کے ضابطے اور قاعدے مقرر کر کے تصرّف کرنے والے کے تصرّف کو جائز قرار دیتا ہے تو یہ خود ایسا عمل ہے جس کا دائرہ اثر اس کے اپنے تصرّف سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

کسی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا ظالمانہ تصرّف ہے، مگر اس کا مظلوم یعنی اس سے متاثر ہونے والا صرف ایک شخص ہے۔ مگر ایسا ضابطہ بنا دینا کہ فلاں عمل کرنے والے کو گولی مار دی جائے اور فلاں عمل کرنے والے کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ ایسا تصرّف ہے جس کا تختہ مشق ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد اور بے شمار انسان ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کسی آرڈی ننس کا جاری کر دینا ایسا تصرّف ہے جو پورے ملک کے تمام باشندوں کو متاثر کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ملوکیت اور شہنشاہیت کو انسانی بھائی چارے اور انسانی مساوات کے خلاف سمجھتا ہے، وہ افراد انسان کی کسی کمیٹی کو بھی وضع دستورِ اساسی کا اختیار دینا مساواتِ انسانی کے خلاف سمجھتا ہے۔

ان کا علم محدود، مستقبل کی ان کو خبر نہیں، حال پر بھی ان کو پورا اختیار نہیں، وہ انسانی طبقات کے مختلف جذبات سے ناواقف فطری رجحانات جو ایک ہی نوع کے مختلف حلقوں میں ہوتے ہیں۔ ان سے بھی وہ پوری طرح باخبر نہیں۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے قانون بنائیں اور ان کی گردنیں دستوری دفعات کے شکنجے میں کسیں۔ مساواتِ انسانی کا نازک نظریہ اس کو برداشت نہیں کرتا، اسی لیے وہ وضع قانون کا اختیار صرف اس کو دیتا ہے جو حقیقی مالک ہے اور چونکہ وہ خالق ہے

لہٰذا وہ ان تمام جذبات و رجحانات سے واقف ہے جو انسانوں کے مختلف طبقات اور نوعِ انسانی کی مختلف صنفوں میں ہوتے ہیں اور چونکہ وہ خالق و مالک ہے اس کو حق ہے کہ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے اور جو چاہے ان کیلئے دستور بنائے۔

انسان کا انسان کے لیے قانون بنانا سراسر بے محل ایک طرح کا جبر و قہر ہے اس لیے قرآنِ حکیم ان سب کو ظالم و فاسق یا کافر قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مرتب کردہ دستورِ اساسی کے خلاف کوئی دستور بنائیں یا ایسے دستور کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ خداوندی کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کریں۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۴ تا ۴۷)

اس نظریہ اور فکر کے بموجب جب انسان کو قانون سازی کا حق نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے دائرہ اقتدار میں نہ دستور ساز اسمبلی ہوگی نہ آئین ساز کونسل نہ ان کے انتخابات ہوں گے اور نہ وہ بے پناہ مصارف ہوں گے جو پارلیمنٹ، کونسل، ان کے عہدہ داروں، وزراء اور منسٹروں پر ہوتے یا ان کے انتخابات کے سلسلہ میں برداشت کیے جاتے ہیں۔

دستورِ اساسی

اسلامی نقطۂ نظر سے قرآنِ حکیم دستورِ اساسی ہے جس کی تشریح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات، پھر حضرات خلفائے راشدین کے طریقہ ہائے کار اور جماعتِ صحابہ کے طرزِ عمل نے کی، اسی کا نام الشریعة الدین اور السنة ہے۔

اسی دستورِ اساسی کی موجودگی میں کوئی اور دستور وضع نہیں کیا جائے گا، البتہ پیش آنے والے معاملات کے مطابق اسی دستور کے اصول مسلمہ سے ضابطے اور قاعدے اخذ کیے جائیں گے اور ان کی روشنی میں معاملات کے فیصلے ہوں گے۔

مجلسِ آئین ساز کے بجائے عدالت عالیہ

اپنی جان، اپنا مال، غیر کی جان اور اس کا مال، رشتہ دار، پڑوسی شہری ملکی غیر ملکی، غیر مسلم وغیرہ کے حقوق، فرائض جرائم کی حیثیت، ان کی سزائیں، جنگ و صلح کے بنیادی ضابطے، خرید و فروخت، ہبہ، عاریت، اجارہ تحفظ، نسل، ازدواجی تعلقات وغیرہ کے ضابطے اور اصول قرآنِ حکیم اور سنّت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام) نے مقرر کر کے نوعِ انسان کو وضع دستور اور قانون سازی کی اُلجھنوں سے آسودہ اور اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ صرف وہ کام باقی ہے جو کسی قانون کے پیشِ نظر عدالت کو کرنا پڑتا ہے۔

پیش آنے والے معاملات میں ہماری عدالتیں پارلیمنٹ یا اسمبلی کے وضع کردہ دستور یا قانون کو تلاش کرتی ہیں اس کا منشا سمجھتی ہیں اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرتی ہیں اسلامی عدالتیں قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں گی۔

اراضی کی ملکیت، ملکیت کی نوعیت واجبات یعنی پیداوار کے سلسلہ میں سرکاری مطالبات، افتادہ اراضی، کانوں اور چشموں کی حیثیت پہاڑ، دریا، ان کی قدرتی پیداوار وغیرہ کے متعلق سوالات پیدا ہوتے۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ نے کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں ایک مجموعۂ قانون مرتب کر دیا جو کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے دَور میں اسی نے آئین کی حیثیت اختیار کر لی۔ پیش آنے والے سوالات کے متعلق مجلسِ قانون ساز کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ اُسی آئین کے مضمرات سے جوابات اخذ کیے گئے اور اُنہیں کو بائی لاز (BYLYAZ) اور ضمنی قوانین کی حیثیت دی گئی۔

اسلامی نظامِ حکومت کا مقصد

دستورِ اساسی (کتاب اللہ و سنّت رسول اللہ) اور عدالتِ عالیہ کے بعد معاملہ صرف نفاذ کا رہ جاتا ہے جس کے لیے انتظامی عملہ کی ضرورت ہے، مقنّنہ کی نہیں۔

اسلامی حکومت کا پورا نظام اس لیے ہوتا ہے کہ قانونِ اسلامی کو نافذ کرے اور جو حکومت اس مقصد کے لیے ہو وہی اسلامی حکومت ہے۔

تشکیلِ حکومت اور سربراہِ مملکت

قرآن حکیم یا احادیثِ مقدسہ نے تشکیلِ حکومت کے لیے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا ہے صرف ایک بنیادی تعلیم دی ہے کہ سربراہ کا تقرر نسل اور خاندان کی بنا پر نہ ہو اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر ہو یہ سربراہ کس طرح بنایا جائے۔ کتاب و سنت نے اس کو بھی موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ البتہ سربراہ کے اوصاف بیان کر دیے ہیں اور اس کے فرائض مقرر کر دیے ہیں۔ اب ـــ

۱۔ اسلامی مملکت کا سربراہ عوام کی آراء سے بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ بشرط یہ ہے کہ مدارِ انتخاب وہ اوصاف ہوں جو اسلامی مملکت کے سربراہ میں ہونے چاہییں جو آغازِ مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سربراہ جو ان اوصاف کا حامل ہو انتخاب کے قصہ میں نہ پڑے اور خود اپنی جانب سے اپنا کوئی ایسا قائم مقام نامزد کر دے جو ان اوصاف کا حامل ہو اور عوام میں متعارف ہو۔

۳۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سربراہ جو اوصافِ سربراہی کا صحیح طور پر حامل ہو اپنی جانب سے کچھ اہل الرائے حضرات کو نامزد کر دے کہ وہ آئندہ کے لیے کوئی سربراہ نامزد کر دیں جو اوصافِ سربراہی سے متصف ہو۔

اسلام جبر و قہر کی اجازت نہیں دیتا لیکن اگر کوئی اپنی طاقت کے بل بوتے پر سربراہ بن جائے تو مسلمان اس کی قیادت تسلیم کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہ کرے اور ایسے اوصاف کا حامل ہو جو فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

مشورہ اور ارکان مشورہ (شوریٰ)

اسلام نے جس طرح تشکیل حکومت کو کسی خاص نوعیت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اسی طرح ارکانِ شوریٰ کے انتخاب یا نامزدگی کا بھی کوئی ضابطہ نہیں مقرر فرمایا اور واقعہ یہ ہے کہ جن امور کا تعلق الٰہیات (اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات) اور عبادات سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق تجربات اور مشاہدات سے ہے اسلام نے ایسے امور میں فکرِ انسانی کو آزاد چھوڑا ہے، بہرحال اگرچہ ارکان شوریٰ کے انتخاب وغیرہ کے بارے میں کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا مگر سربراہ پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہر ایک منصوبہ کے متعلق مشورہ کرے عمل کرنے کا عزم اس وقت کرے جب پہلے مشورہ کر لے ــ پہلے مشورہ ــ پھر خدا پر بھروسہ ــ ان دو کے بیچ میں عزم ہونا چاہیئے (آل عمران ۳ آیت ۱۵۹)

پھر مشورہ کو یہاں تک اہمیت دی ہے کہ اس معاملہ کو مسلمانوں کا معاملہ ہی نہیں قرار دیا جو آپس کے مشورہ سے طے نہ ہو (سورہ ۴۲ شوریٰ آیت ۳۸)

جبکہ مجلسِ شوریٰ کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ــ

۱۔ ارکانِ شوریٰ کا انتخاب عوام کی رائے سے ہو، بشرطیکہ مدار انتخاب ان کے وہ اوصاف ہوں جو اسلامی مملکت کے مشیر کے ہونے چاہئیں۔

۲۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الگ الگ انتظامی حلقے ہوں اور ان حلقوں کے سربراہ پوری مملکت کے سربراہ کا انتخاب کریں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں کچھ حلقے ہوتے تھے ان حلقوں کے سربراہ کو نقیب کہا جاتا تھا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ ہوازن کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی چاہی تو مجمع عام میں جو پکار دیا گیا تھا کہ "ہم راضی ہیں" اس پر اعتماد نہیں فرمایا بلکہ ان عرفاء (امیران قبیلہ یا محلہ) کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے طور پر اپنے اپنے حلقے میں فرداً فرداً ہر ایک کی رائے معلوم کریں جب ان کی رپورٹیں موصول ہو گئیں تب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے

فیصلہ فرمایا (بخاری شریف صفحہ ۳۵۵) وغیرہ

۳۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سربراہِ مملکت ان لوگوں کو خود نامزد کردے جو ووٹنگ کے ذریعے نہیں، بلکہ اپنے اخلاق، کردار، اپنی قابلیت اور صلاحیت اور خدمات کی وجہ سے اُوپر آچکے ہوں اور بہتر کردار کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ ممتاز شخص بن چکے ہوں۔

۴۔ ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نامزد یا منتخب کسی کو بھی نہ کیا جائے بلکہ ہر پیش آنے والے معاملے میں۔ اس معاملہ سے تعلق رکھنے والے صاحبِ بصیرت اور تجربہ کار حضرات کو دعوت دی جائے اور ان سے فیصلہ کرایا جائے۔

کتاب وسنّت کے اشارات کے بموجب سب سے اہم اور سب سے بنیادی بات سربراہ کا "تقویٰ" ہے۔ اس کے دِل میں خدا کا خوف ہو۔ نوعِ انسان اور خلقِ خدا کا ہمدرد ہو، صاحبِ بصیرت دیانت دار، باحوصلہ اور بیدار مغز ہو اور فرائض کی لگن رکھتا ہو۔

اگر مملکت کو اس طرح کا سربراہ میسّر آگیا ہو تو نہ اس کو پارلیمنٹ کی ضرورت ہے نہ مجلسِ وزراء کی۔ خصوصاً ۳ و ۴ والی صورتیں اس وقت صحیح قرار دی جاسکتی ہیں جب سربراہ میں اخلاص، کردار اور پاکبازی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ باخدا اور خداترس ڈکٹیٹر ہزاروں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں سے بہتر ہے۔ خوفِ خدا نہ ہو تو سب بے کار۔

شوریٰ کا کام

بے شک دستور اور قانون بنانا شوریٰ سے متعلق نہیں ہے، مگر نفاذِ دستور کے سلسلہ میں بہت سے مرحلے ایسے آتے ہیں جس کو اگر شوریٰ کے بغیر امام اور سربراہ اپنی رائے سے طے کردے تو جبر و قہر اور استبداد قرار دیئے جائیں گے۔ ان میں نہ صرف شوریٰ کی ضرورت ہوگی بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ ارکان شوریٰ بارسوخ ہوں، عوام کے مزاج کو

پہچانتے ہوں اور عوام بھی ان پر اعتماد کرتے ہوں ان کی رائے عوام کی رائے ہو اور فی الواقع عوام کے ترجمان ہوں۔

مثال صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس سے شوریٰ کی ضرورت، اس کی نوعیت اور اس کے فرائض کا اندازہ ہو جائے گا۔

سورہ ۸ انفال کی آیت ۶۰ کا مفاد یہ ہے "کہ مسلمانوں کو بین الاقوامی سیاست کے اسٹیج پر اس طرح بالادست ہو کر رہنا چاہیے کہ دوسری قومیں ان سے متاثر رہیں اور اس کے لیے جس قسم کے ساز و سامان کی ضرورت ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کو تیار رکھیں۔"

آج دُنیا میں روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ جاری ہے۔ ہر ایک بلاک دوسرے کو مرعوب کر رہا ہے۔ یہ میدان مسلمانوں سے خالی ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں مسلمانوں اور ان کی تمام مملکتوں کا شمار پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے حاشا وکلاّ قرآنِ حکیم مسلمانوں کے لیے یہ ذلّت گوارا نہیں کرتا۔ قرآنِ پاک کی تلقین یہ ہے کلمۃ اللہ ہی العلیا اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا تھا: الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ (اسلام بلند ہو کر رہتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کو اسلام پر بلندی حاصل ہو) سائنسی تحقیقات اور ترقی کا کام دوسروں نے لے لیا۔ اسی راستہ سے وہ دُنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور تمام دُنیا کو مرعوب کر رہے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی تعلیم اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کے بموجب اسلامی حکومت کو ایسا بیدار مغز ہونا چاہیے کہ اس میدان میں بھی اس کا قدم سب سے آگے رہے وہ کسی کے دست نگر نہ رہیں۔ دوسروں کو ان کا دست نگر رہنا چاہیئے۔

۔۔۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے سے خائف نہ ہوں دوسروں پر ان کی دھاک رہنی چاہیئے۔

(سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۳)

اس ترقی اور برتری کے لیے بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ زکوٰۃ و صدقات

اور عشر جو خوشحال مسلمانوں پر فرض ہوتے ہیں وہ ضرورت مند، عیال دار، فقراء و مساکین کا حصّہ ہیں ان کی رقومات ان مدات پر ہی خرچ کی جائیں گی۔ ترقی اور استحکام قوت کے مدات پر خرچ نہیں ہو سکتیں۔

خراج، جزیہ اور اسلامی تعلیم کے بموجب عشور یعنی درآمد و برآمد مال کے ٹیکس اور اسی طرح کے معینہ مدات کی آمدنی اگر ان ضرورتوں کے لیے ناکافی ہو (جو ترقی پذیر تعلیم و تربیت اور ریسرچ و تحقیقات اور سامانِ جنگ کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں رونما ہوں) تو مجلسِ شوریٰ یہاں اپنا فرض انجام دے گی، یعنی ماہرین کی امداد سے ذرائع آمدنی میں اضافہ کرے گی۔

کارخانے اور فیکٹریاں

یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ لوگ اپنی محنت اور اپنی گاڑھی کمائی سے کارخانے اور مل قائم کریں اور حکومت ان کو نیشنلائز کر کے اپنے قبضہ میں لے لے۔ حکومت کو غاصب نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکومت کو ایسا فرض شناس ہونا چاہیئے کہ وہ پہلے ہی اپنی طرف سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لے۔

ترقیاتی پلان اور منصوبے آج بھی پارلیمنٹ اسمبلی یا مجلس وزراء نہیں بناتی۔ بنانے والے اور ہوتے ہیں، پارلیمنٹ ان کی منظوری دیتی ہے کیا اچھا ہو کہ شوریٰ کے ارکان وہ ماہر ہوں جو اس طرح کے منصوبے بنا سکیں۔ آخر ایسے ہی ماہرین کو شوریٰ کا (پارلیمنٹ کا) ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا کیا وہ عوام کی ضرورتوں اور رجحانات سے بے خبر ہوتے ہیں وہ عوام کی نمائندگی کیوں نہیں کر سکتے؟

خسارہ کو پورا کرنے والا آمدنی کا ایک مدّ

قرآنِ حکیم نے ایک مستقل مد قرار دے دیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں خرچ کرنا)

چنانچہ سورۃ انفال کی مذکورہ بالا آیت کا آخری حصّہ یہ ہے :

" اللہ کے راستہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پُورا پُورا ادا کیا جائے گا۔
اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (الانفال، آیت ۶۰)

سورہ ۴۷ محمدؐ کی آخری آیت ۳۸ کا مفہوم یہ ہے :

"تم کو دعوت دی جارہی ہے کہ تم راہِ خدا میں خرچ کرو۔ تم میں سے کچھ وہ ہیں جو اس دعوت کے جواب میں بخل سے کام لیتے ہیں (خرچ نہیں کرتے) دیکھو یہ اگر بخل کرتے ہیں تو اپنے سے (اپنے مفاد سے) بخل کر رہے ہیں۔ اللہ کو ضرورت نہیں وہ بے نیاز ہے۔

(اعلیٰ تعلیم۔ ترقی پذیر تربیت، سائنسی ایجادات و ترقیات یہ تمہاری ضرورتیں ہیں)
تم ہی ضرورت مند ہو (خود تمہاری باعزت بقا کے لیے ان کی ضرورت ہے)
اگر تم منہ موڑتے ہو تو تم ختم ہو جاؤ گے اللہ تعالیٰ تمہارے بدلہ میں کسی دوسری قوم کو کھڑا کرے گا جو تم جیسی تن آسان قرض ناشناس اور مفاد پرست نہیں ہو گی۔

سورہ ۲ بقرہ میں جنگ و قتال کے متعلق ہدایات دینے کے بعد ارشاد ہے :

" خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں بربادی اور ہلاکت میں " (آیت ۱۹۵)

قرآنِ حکیم میں اس انفاق فی سبیل اللہ کو " قرضِ حسنہ " سے تعبیر کیا گیا ہے
یہ گویا قومی یا ملّی قرض ہوتا ہے۔ ہماری حکومتیں بھی قومی یا جنگی قرض لیتی ہیں جن کا سُود بھی ادا کرتی ہیں، مگر اس سُود کے نتیجہ میں ان قومی اور جنگی قرضوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ دولت مند جو قرض دینے والے ہیں ان کی دولت بڑھ جاتی ہے اور اس تمام قرض کا بار ملک کے تمام غریب ٹیکس دینے والوں پر پڑتا ہے۔

دولت مند یہ قرض دے کر بظاہر قوم کی خدمت کر رہا ہے لیکن فی الحقیقت قوم کا خون چوس رہا ہے اور اپنی امیری بڑھا رہا ہے۔ قرآنِ حکیم جس قرض کا مطالبہ کرتا ہے

اس کا کوئی بار غریب اور محنت کش طبقہ پر نہیں پڑتا، صرف دولت مند پر اس کا بار پڑتا ہے۔ اسی کی گرہ میں سے اس کی خالص پونجی خرچ ہوتی ہے اگرچہ یہ وعدہ بھی ہے:

کہ تم کو پورا پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔" (سورہ ۸ انفال آیت ۶۰)

اس پورا پورا ادا کرنے کی شکل یہ ہے کہ ترقیات کے مفادات سے یہ دولت مند بھی بہرہ اندوز ہوں گے، چنانچہ:

جن صحابہ کرام (رضہ) نے ارشادِ خداوندی کی تعمیل کرنے کے لیے خرچ کیا تھا اُن میں بہت سے وہ بھی تھے کہ ثوابِ آخرت کے علاوہ دُنیا میں بھی ان کو پورا پورا بلکہ پورے سے بھی بہت زیادہ ادا کر دیا گیا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی حالت ابتداء زمانہ میں یہ تھی کہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اونٹ کے چارے اور چولھے کے سوختے کے لیے گٹھلیوں وغیرہ کا بار دو تین میل کے فاصلہ سے خود اپنے سر پر رکھ کر لایا کرتی تھیں مگر تقریباً تیس سال بعد جب وہ شہید ہو گئے تو ان کا ترکہ پانچ کروڑ سے زیادہ کا تھا جو قطعاً جائز اور پاک آمدنی سے حاصل ہوا تھا۔ جبکہ تمام غزوات میں پیش پیش رہے تھے اور کروڑوں درہم راہِ خدا میں خرچ کیے تھے۔ (بخاری شریف ص۴۴۱ و ص۴۴۲)

دوسری شکل

اور پورا پورا ادا کرنے کی دوسری شکل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے درج اتنے بڑھائے جائیں کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہو وہ اس زمرہ میں ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی طرح "منعم علیہم" فرمایا ہے اور ان کو ابدی حیات کی بشارت دی ہے۔

بہرحال اس قرض کی ادائیگی باشندگانِ ملک کی جیب سے نہیں ہوگی۔ ارکانِ شوریٰ کا فرض ہوگا کہ اسلامی مملکت کی ترقی پذیر ضرورتوں کا جائزہ لیں، ان کا بجٹ بنائیں، بجٹ

کو پُورا کرنے کے لیے قرضِ حسنہ حاصل کریں۔ دولت مندوں کا فرض ہوگا کہ جو اُن کے ذمہ کیا جائے وہ اس کو خوش دلی سے ادا کریں یہ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ زکوٰۃ کی طرح اس کی ادائیگی بھی فرض ہوگی اور زکوٰۃ کی طرح اس کا ثواب بھی بیش از بیش ہوگا جس کی تائید بے شمار آیات اور احادیث سے ہوتی ہے۔

اس قرض للہ اور فی سبیل اللہ کی شرح کیا ہوگی۔ اگر امام از خود کسی آرڈی ننس سے طے کر دیتا ہے تو ایک طرح کا جبر ہوگا، لیکن اگر ارکانِ شوریٰ جو با اثر اور بارسوخ بھی ہوں وہ طے کرتے ہیں تو سب کے لیے قابلِ برداشت ہوگا۔

اسی طرح ترقی پذیر اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی ضرورتیں ہیں۔ ان کے مصارف بھی ایسی ہی آمدنی یا قرض للہ پُورے کیے جائیں گے۔ شوریٰ کا فرض ہوگا کہ ان تمام ضرورتوں کا جائزہ لے کر بجٹ بنائے۔ ممکن ہے اس کو قانون سازی کہہ دیا جائے، مگر ہمارے خیال میں یہ قانون اور "لا" نہیں بلکہ یہ حکمِ خداوندی کے نافذ کرنے کی صورتیں ہیں۔

دولت کا اندازہ

زکوٰۃ کی رقم ان مدات میں خرچ نہیں کی جائے گی، البتہ زکوٰۃ سے دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس نے ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ میں دیا ہے اس کا کُل اثاثہ چالیس ہزار ہوگا۔

بہرحال اس قسم کے کام ہوں گے جن کو ارکانِ شوریٰ زیرِ قیادت امام انجام دیں گے۔ (یہ ہے اسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ)

اس تاریخی حقیقت پر سلسلۂ کلام کو ختم کیا جاتا ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ سب سے پہلے آپؐ ہی نے دفاع کے لیے خندق کی تجویز منظور فرمائی۔ عرب اس سے قطعاً ناآشنا تھے۔ جب حملہ آوروں نے جن میں پُورے عرب کے قبائل تھے دفاع کا یہ نیا طریقہ دیکھا تو حیران

رہ گئے۔ اگرچہ فتح نصرتِ خداوندی سے ہوئی مگر یہ خندق دشمن کی ناکامی کا پیش خیمہ بن گئی۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ہی نے سب سے پہلے منجنیق اور دبّابہ کو استعمال کرایا جب آپؐ قلعہ طائف پر حملہ کر رہے تھے یہ اُس زمانہ کے ترقی یافتہ آلاتِ حرب تھے جن کو تاریخِ اسلام میں سب سے پہلے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم نے استعمال فرمایا، کیونکہ مقصدِ رحمت اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک ظلم کی طاقتیں پامال نہ ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ تمام عالم پر چترِ رحمت اُسی وقت سایہ فگن ہو سکتا ہے جب بین الاقوامی سیاست میں بالادستی اور شانِ قیادت حاصل ہو ہم سُود کو بدترین ظلم سمجھتے ہیں، مگر ہم تمام احتیاطوں کے باوجود سود لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں، کیونکہ جس اقتصادی نظام میں ہم جکڑبند ہیں وہ بینک سسٹم ہیں اور جب تک اقتصادیات عالم کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں نہ ہو آپ بینک سسٹم ختم کر کے کوئی متبادل نظام قائم نہیں کر سکتے۔

سُود کے متعلق قرآنِ حکیم کا فیصلہ دستورِ اساسی کی ایک دفعہ ہے۔ مجلسِ شوریٰ اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی، البتہ متبادل صورتیں طے کرنا اور ان کو نافذ کرنا اس کا فرض ہوگا۔

مگر افسوس اس وقت دُنیا میں مسلمانوں کی کوئی حکومت بھی اس قابل نہیں کہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو سکے اور افسوس یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں کہ حاملِ قرآن ہونے کی حیثیت سے ان کا کیا فرض ہے۔

والی اللہ المشتکی

محمدؐ میاں

۸ رجمادی الاخریٰ ۱۳۸۹ھ

۲۲ راگست ۱۹۶۹ء